ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۳۹

چوتھا سال: تیسری کتاب

مارچ ۲۰۰۶ء

مراسلت: C/۵۴۵ گل گشت کالونی، ملتان

ای میل: angarey_90@hotmail.com

ویب سائٹ: www.apwn.net/urdu

فون: ۰۶۱-۶۵۲۳۴۸۶، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

کمپوزنگ: اظہر خان، یونی کارن کمپوزرز، چونگی نمبر ۶، ملتان

قیمت: تیس روپے

زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں — سیّد عامر سہیل — ۳

مضامین:

۲۔ پروفیسر اصغر علی شاہ کا چہار مقالہ — ڈاکٹر محمد امین — ۵

۳۔ نوجوان ادیب نسل کی کارکردگی: ایک تاثر — روش ندیم — ۹

۴۔ ژونگ کے بارے میں چند فکری تحفظات — تنویر صاغر — ۱۲

گوشۂ ظفر اقبال:

۵۔ ظفر اقبال کے کلام میں صنائع بدائع کا حُسن — پروفیسر مزمل حسین — ۱۷

۶۔ ظفر اقبال کی شاعری۔ ایک تاثر — سیّدہ سیفو — ۲۷

۷۔ ظفر اقبال کی ۲۶ غزلیں — ۳۱

کہانیاں:

۸۔ شاہراہِ مسرت — ڈاکٹر عباس برمانی — ۴۴

۹۔ عطیہ — عابد میر — ۴۶

کتابوں پر تبصرہ:

۱۰۔ ''تمنا بے تاب'' از ڈاکٹر رشید امجد (ایک جائزہ) — زاہد یعقوب — ۵۱

۱۱۔ رضی الدین رضی کا آدھا سچ — ڈاکٹر عباس برمانی — ۵۳

۱۲۔ ''ملبے میں دبے ہوئے لفظ'' از شاکر حسین شاکر — ڈاکٹر شگفتہ حسین — ۵۶

غزلیات:

۱۳۔ احمد فراز (۲ غزلیں)، احمد صغیر صدیقی (ایک غزل)، خاور اعجاز (۴ غزلیں)، خیال امروہوی (۲ غزلیں)، شارق بلیاوی (۲ غزلیں)، حصیر نوری (۲ غزلیں)، غفار بابر (۲ غزلیں) — ۵۸

نظمیں

۱۴۔ تشبیب فی ھجو النسیب (اصغر علی شاہ)، ایک کیفے (اصغر علی شاہ)، شاعری (احمد صغیر صدیقی)، سارا شگفتہ سے براہِ راست (ندیم ساحل)، کون دہشت کا مرتکب ہے (مشتاق شبنم)، غارِ ثور سے کائنات کا نظارہ (روش ندیم)، دو نظمیں (فیروز شاہ) — ۶۶

حروفِ زر:

۱۵۔ قارئین کے خطوط — بنام مرتب — ۷۵

سیّد عامر سہیل

چند باتیں

گزشتہ دنوں برسی کے موقع پر حبیب جالب پہلے سے زیادہ یاد آئے بلکہ شدت سے یاد آئے۔خصوصاً کمر توڑ مہنگائی، بدامنی، لوٹ مار، افراتفری اور عدم تحفظ کے شدید ترین احساس میں ڈوبے ماحول میں۔ ہمارے گردوپیش حالات روز بہ روز ابتر صورتِ حال اختیار کرتے جا رہے ہیں مگر افسوس آج ہمیں کہیں بھی جالب نظر نہیں آتا۔شکستہ دلوں اور خراب حالوں کا فکری سہارا_____ حبیب جالب کو آپ جس بھی ادبی مقام و مرتبہ سے نوازیں (بلند یا پست؟) ایک بات طے ہے کہ وہ ظلم کو ضیا اور صرصر کو صبا نہیں کہے گا اور ہر عدم توازن کے رویے پر صدائے احتجاج بلند کرے گا۔اسے جالب کا ذاتی مسئلہ کہیں یا اُس کی نظریاتی کمٹ منٹ، ہر حال میں وہ مزاحمتی علامت ہی نظر آتا ہے۔ برستی گولیوں اور کڑکتے تازیانوں میں اکثر لوگوں نے اُسے لہو رنگ ہی دیکھا ہے۔فیض، منٹو اور جالب ایسے لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کا اجتماعی ضمیر ہوتے ہیں۔آپ انہیں (تمام تر نظریاتی اختلاف کے باوجود) ایک رول ماڈل کے طور پر دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔

مگر آج ہمارے ادب کا دامن جالب ایسے شاعروں سے خالی کیوں ہوتا جا رہا ہے؟ امید اور روشنی کی کرن دکھانے والے اور اپنی نظریاتی وابستگی پر قائم رہنے والے کہاں گم ہوتے جا رہے ہیں؟ یہ سوالات بار بار ذہن میں آ رہے ہیں۔آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے جس شاعری کی بات کی جا رہی ہے وہ تو ہنگامی بنیادوں پر استوار تھی اور اس کی زندگی بہت کم ہے۔بعض اہلِ علم اس انداز کی شاعری کو نا خالص شاعری قرار دیں گے؛ یہ بات اپنی جگہ درست مگر آپ ایسی شاعری کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے کہ اس میں آپ کو اپنے عہد کا پورا منظر نامہ دکھائی دے گا اور تاریخی حوالے سے یہ شاعری اپنے عہد کا بے مثال سچ بن کر سامنے آئے گی۔ میں یہاں جالب اور اس کی شاعری کا دفاع نہیں کر رہا مگر ایک معاشرے کو سچ کی خُو دینے اور سچ کہنے کا ہنر سیکھانے کے لئے ایسے شاعری ناگزیر ہے۔کتنی عجیب بات ہے کہ اپنے دور کے بڑے بڑے آمر جالب سے خوف زدہ رہے اور اس کے ہر لفظ پر انہیں اپنی آمرانہ سلطنت ڈولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ یقیناً یہ لفظ اور اس کے اندر چھپی ہوئی سچائی کا اثر تھا۔

مگر آج صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔آج کا شاعر سرکاری دعوتوں کو قبول کرنے، شاہی دسترخوانوں سے بچے نوالوں کو حاصل کرنے اور بے ہودہ قصیدہ گوئی کرنے کو اپنا ہنر سمجھتا ہے۔ سوئے ہوئے ضمیروں کے ساتھ مردہ لفظوں کی تجارت آج کی شاعری کا اہم حوالہ ہے۔سرکاری محکموں کی نمبرداری کے حصول کے لئے چلم برداری کرنے والے بڑے شاعر اپنے زعم میں بڑی شاعری تخلیق کرنے

کے دعوے دار ہیں مگر تاریخ اور وقت ایسے شاعروں کو کبھی یاد نہیں رکھیں گے۔ میں جالب کو بڑا یا عظیم شاعر نہیں کہتا مگر شاعری اور شاعروں کی عزت، اہمیت اور وقار کی علامت ضرور کہتا ہوں۔اسی طرح ایک اور حوالے سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایسی شاعری اپنے عہد اور سماج کو سمجھنے کا اہم ترین ذریعہ ہوتی ہے نیز کسی بھی عوامی تبدیلی کو برپا کرنے والے عوامل میں ایسی شاعری سب سے اہم بنیاد فراہم کرتی ہے۔

آج ہمارے یہاں بڑے اور عظیم شاعر موجود ہیں، ان کا شعری حوالہ بھی ناقابلِ فراموش ہے مگر افسوس آج ہم میں کوئی فیض، منٹو اور حبیب جالب موجود نہیں ہے۔

☆☆☆

ضروری وضاحت:

گزشتہ شمارے (فروری ۲۰۰۶ء) میں خاور اعجاز صاحب کی چار غزلیں غلطی سے پرویز ساحر صاحب کے نام سے شائع ہو گئی تھیں۔ یاد رہے کہ یہ غزلیات خاور اعجاز صاحب کی ہیں۔مرتب خاور اعجاز اور پرویز ساحر سے معذرت خواہ ہے۔

☆☆☆

اردو کے عہد ساز شاعر کے حوالے سے ''انگارے'' کا

ظفر اقبال نمبر

شائع کیا جا رہا ہے

آپ سے گزارش ہے کہ ظفر اقبال اور ان کی شاعری کے حوالے سے اپنی شخصی، تنقیدی اور تحقیقی تحریریں جلد از جلد تک ارسال فرما دیں۔

ڈاکٹر محمد امین

پروفیسر اصغر علی شاہ کا چہار مقالہ

ایک شاگرد کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز اور سعادت ہو سکتی ہے کہ اس کا استاد اس سے اپنی کتاب پر لکھنے کے لیے کہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ آج مجھے یہ سعادت اور اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ ویسے بھی یہ شاگرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے استاد کے بارے میں لکھے جس سے اس نے سیکھا۔ آج میں یہ فرض بھی ادا کر رہا ہوں۔ میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے بہت اچھے اساتذہ ملے۔ میں نے پروفیسر اصغر علی شاہ سے چار سال تک عربی پڑھی۔ عربی پڑھنے والے طالب علموں کی تعداد بہت کم ہوتی تھی اور اب بھی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ پروفیسر اصغر علی شاہ نے مجھے عربی بڑی محنت سے پڑھائی کہ آج بھی مجھے عربی سے خاصی شناسائی حاصل ہے۔

جن دنوں میں طالب علم تھا پروفیسر اصغر علی شاہ کے بارے میں مشہور تھا کہ انہوں نے کئی مضامین میں ایم اے کر رکھا ہے اور وہ کئی زبانیں جانتے ہیں۔ پروفیسر اصغر علی شاہ اُردو، پنجابی، سرائیکی کے علاوہ انگریزی، عربی، فارسی، ہندی اور سنسکرت پر دسترس رکھتے ہیں۔ وہ زبانوں کے مزاج دان ہیں اور یہ صلاحیت اور مہارت قدرت کی طرف سے عطا کی گئی ہے۔ زبان و ادب کے علاوہ اصغر علی شاہ کو تاریخ اور ریاضی سے بھی گہری رغبت ہے۔

اصغر علی شاہ شاعر ہیں اور شاعری میں منفرد انداز رکھتے ہیں۔ ان کا اُسلوب سب سے الگ ہے۔ وہ زبان پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اپنے اشعار میں تلمیح، محاورہ، لفظی و معنوی صنائع استعمال کرتے ہیں اور اس میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ان کا یہ انداز مختلف ہے کیونکہ آج کل شاعری میں یہ اُسلوب متداول نہیں۔ عام شعرا کی نسبت اصغر علی شاہ کی شاعری کا لغت بہت وسیع ہے۔ وہ مختلف زبانوں کے الفاظ موزونیت اور مناسبت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ قدیم دَور میں نثر لکھنے کا رواج نہیں ملتا۔ ہر بات شعر کی زبان میں کہی جاتی تھی اور یہی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ ویسے بھی شاعری بات کہنے کا موثر ذریعہ ہے۔ اصغر علی شاہ اسی خوبی میں یقین رکھتے ہیں اور اسی سبب انہوں نے نثر کی طرف توجہ نہیں دی اور ہر بات کو نظم کے انداز میں بیان کیا۔ انہیں ہر مضمون کو منظوم کرنے کی قدرت حاصل ہے اور ان کا یہ کمال قابلِ تعریف ہے۔ اصغر علی شاہ زبانوں پر بخوبی کام کر سکتے تھے۔ وہ ایک ماہر لسانیات کے طور پر اپنا لوہا منوا سکتے تھے لیکن مکروہاتِ زندگی کی وجہ سے انہیں یہ علمی و تحقیقی کام کرنے کے مواقع بہت کم میسر آئے۔ ہم بھی ان سے یہ زبانیں سیکھنے کا کوئی بندوبست نہ کر سکے کیونکہ سنسکرت جاننے والے تو صرف چند لوگ ہیں۔

پروفیسر اصغر علی شاہ نے اب نثر کی طرف توجہ کی ہے اور یکے بعد دیگرے مفصّل اور معلومات

افزا مضامین لکھے ہیں۔ علم الاصوات، علم العروض، الف لیلہ و لیلہ اور قصیدے کے بارے میں مبسوط مضامین لکھے ہیں جن کا ہر فقرہ معلومات سے بھرپور ہے۔ علم الاصوات اور علم العروض کا تعلق لسانیات سے ہے۔ یہ مضامین عربی نصاب کا حصہ ہیں اور اصغر علی شاہ کی ادبی دلچسپی کا مرکز ہیں۔ علم الاصوات لسانیات کا اہم موضوع ہے جس پر اب نئے علمی حوالوں سے تحقیق ہو رہی ہے جن میں حیاتیاتی اور بشریاتی اہم حوالے ہیں۔ زبان کی بنیاد آوازوں پر ہے۔ حروفِ تہجی مختلف آوازوں پر مشتمل ہیں، آواز کا تعلق ناک، منہ، لب، منہ کے اندر کے اعضا، حلق اور سینے سے ہے، ہر آواز کا مخرج الگ ہے، قریب المخرج آوازیں خلط ہو جاتی ہیں، متجانس آوازیں متبادل ہو جاتی ہیں۔ بعض آوازیں بعض زبانوں میں ہیں اور بعض زبانوں میں نہیں ہیں۔ بولنے کا تعلق عادت سے ہے۔ ہمیں اپنی زبان اور جڑوں کو ایک خاص انداز میں استعمال کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اس لیے جو آوازیں ہماری عادت کا حصہ نہیں ہوتیں ان کو ادا کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ آوازیں اُردو میں ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ عربی اور فارسی کی کئی آوازیں صحیح طور پر ادا نہیں ہو پاتیں۔ ان کی حیثیت محض املائی ہے۔ اصغر علی شاہ نے علم الاصوات کی مبادیات بیان کرنے کے بعد عربی، فارسی اور سنسکرت زبانوں کی اصوات کا تقابل بھی کیا ہے۔

پروفیسر اصغر علی شاہ کا یہ مضمون دو اعتبار سے اہم ہے۔ ایک تو اس لحاظ سے کہ اس سے عرب کی علم الاصوات کے بارے میں تحقیق کا علم ہوتا ہے جسے صوتیات میں اساسی حیثیت حاصل ہے۔ دوسرا اُردو میں مروّج عربی و فارسی کی آوازوں کی شناخت اور ان کی صحیح ادائیگی کا علم حاصل ہوتا ہے اور قاری ان الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنا سیکھ سکتا ہے۔ علم الاصوات کی عربی اصطلاحات مشکل ضرور ہیں لیکن اصغر علی شاہ نے ان کی تشریح آسان الفاظ میں کر دی ہے۔ یہ تشریح مطلب سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

عروض کی بنیاد بھی صوت پر ہے کہ عروض میں بھی ایک خاص ترتیب کے ساتھ آوازوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے اور ایک نظم میں اسی ترتیب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ یوں علم الاصوات کا عروض کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ عروض میں مکتوبی نہیں ملفوظی آوازوں کو شمار کیا جاتا ہے اس طرح علم الاصوات اور علم العروض میں ایک بنیادی ربط موجود ہے۔

اصغر علی شاہ کیونکہ عربی کے استاد ہیں اس لیے انہیں عربی، فارسی اور اُردو کے عروض پر دسترس حاصل ہے۔ وہ ہندی عروض پنگل اور چھند سے بھی واقف ہیں لیکن انہیں عربی عروض پر زیادہ مہارت حاصل ہے۔ علم عروض کا زیرِ نظر مضمون کتاب سے کم نہیں۔ یہ مضمون علیحدہ سے ایک مختصر کتاب کی شکل میں بھی چھاپا جا سکتا ہے۔ اختصار و وسعت مطالعہ اور فکری وضاحت کے بغیر بے معنی ہو جاتا ہے۔ وسعت مطالعہ اور تحقیق ہی ایجاز پیدا کرتی ہے۔ یہ مضمون بڑی تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ عروض کے بارے میں بھی اصغر علی شاہ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ عروض کی مصطلحات عربی میں ہیں۔ اصغر علی شاہ ان کے لغوی معانی بھی جانتے ہیں اسی لیے ان کے لیے کم الفاظ میں ان اصطلاحات کی تشریح بہت آسان ہے۔ ان کا

ابلاغ بھی بہتر ہے۔ اُردو میں جن لوگوں نے عروض پر لکھا ہے ان میں سے اکثر کی عربی زبان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی اس لیے انہیں اُردو میں عروض کے مباحث بیان کرنے میں دقت محسوس ہوئی اور عروض کے مضامین لکھنے میں مشکل ہو گئے مگر اصغر علی شاہ کو یک گونہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ عربی زبان وادب پر مہارت رکھتے ہیں۔ عربی سے واقفیت رکھنے والے کے لیے عروض آسان ہے۔

اصغر علی شاہ کا علم العروض دیکھنے اور پڑھنے میں ایک مضمون ہے لیکن پوری ایک کتاب کے مسائل بیان کرتا ہے۔ عروض کا کوئی بھی مبحث ایسا نہیں جو اس میں بیان نہ کیا گیا ہو۔ ارکان افاعیل زحافات، تقطیع کے اصول، بحریں، بحروں کے اوزان مع امثلہ۔ اصغر علی شاہ نے فارسی اور اُردو کی مثالیں جمع کی ہیں۔ آخر میں مثنوی اور رباعی کے اوزان بھی بیان کیے گئے ہیں، رباعی کے چوبیس اوزان یاد رکھنے مشکل ہیں لیکن جامی نے چھ رباعیوں میں یہ چوبیس ارکان استعمال کیے ہیں۔ اشعار کو یاد رکھنا آسان ہے۔ یوں رباعیوں کے ساتھ رباعی کے اوزان بھی یاد ہو جاتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں قافیہ اور قافیہ کے عیوب کا بھی تفصیلی بیان ہے۔ قافیے کے بیان کے بعد چند مروّجہ اصطلاحوں کی تعریف امثلہ کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ مثلاً فصاحت توارد، سرقہ اور تعقید وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے جو بہت مفید ہے۔ اب دیکھئے اس کے علاوہ اور کون سی بات ہے جو رہ گئی ہے، کیا یہ مضمون کتاب کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔ میں نے ایسا مضمون نہیں پڑھا جس میں کسی علم کے تمام مضامین سمو دیئے گئے ہوں۔ اصغر علی شاہ کے بیان میں اثر انگیز جامعیت ہے۔ واقعی انہوں نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ یہ مضمون مشکل اور خشک ضرور ہے اگر اسے توجہ سے پڑھا جائے تو جلد ہی مفاہیم واضح ہو جاتے ہیں۔ یہ مضمون کتابوں پر بھاری ہے۔ طالب علم اور محقق دونوں اس سے بقدر ذوق استفادہ کر سکتے ہیں۔

ہمارے یہاں عروض کے بارے میں شعرا میں عام طور پر مخالفانہ رویہ پایا جاتا ہے۔ ناقدین اور محققین بھی اسے فرسودہ مضمون سمجھتے ہیں اس میں شک نہیں کہ شاعر کی رہنمائی تو اس کا شعری وجدان کرتا ہے لیکن موزونیت طبع کے ساتھ ساتھ علم سے واقفیت کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ عروض پر مہارت نہ سہی لیکن اس سے واقفیت نہایت مفید ہے۔ نئے لسانی نظریات نے شعری لسانیات، گرامر اور عروض وقوافی کے بارے میں پرانے نظریات کو رَد کر دیا ہے۔ اب عروض محض تکنیکی علم ہی نہیں بلکہ ایک سوچ کا مسئلہ ہے، ایک فکری زاویہ ہے، ایک اُسلوب ہے، ایک ثقافت کا مظہر ہے، ایک ذہنی ساخت کا ترجمان ہے۔ یہ موزونیت یہ نغمگی خاص مزاج اور خاص زبانوں سے متحد ہے۔ اب عروض کو کئی دوسرے علمی حوالوں سے دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے کیونکہ اوزان کا تعلق شعری تجربے سے ہے اور شاعر کے باطن سے ہے۔ عروض صرف اوزان کی گنتی کا نام نہیں بلکہ اس کا ثقافتی پس منظر بہت گہرا ہے جو شاعر کے شعور و لاشعور کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے اصغر علی شاہ کے مضمون کی اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔

اُردو میں عروض پر اب تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مفصل کتاب نجم الغنی کی

''بحر الفصاحت'' کو مانا جاتا ہے جو عروض کے ہر پہلو سے بڑی تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بحث کرتی ہے اس سے سب نے استفادہ کیا ہے مگر اس کا انداز بیان پرانا ہے جسے پڑھنے اور سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ آسان مروّجہ اُردو میں عروض کی کتاب کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے جس سے عام قاری بھی فائدہ اُٹھا سکے۔ یہ مضمون اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ بعض مصنّفین نے عروض میں بھی اختراعات کی ہیں، تقطیع کے نئے طریقے دریافت کیے ہیں، نئے اوزان اور نئی بحریں وضع کی ہیں، عربی اوزان کو اُردو الفاظ میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ ان تجربات کے باوجود اُردو عروض کے کلاسیکی قواعد ہی قوی اور حاوی ہیں۔

ملتان میں جابر علی سیّد کو عروض پر بڑی مہارت تھی۔ انہوں نے عروض پر تحقیقی مقالات لکھے جنہیں شہرت حاصل ہوئی مگر عروض کے بارے میں کوئی کتاب نہیں لکھی۔ جابر علی سیّد کے بعد اصغر علی شاہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور عروض پر لکھا اور خوب لکھا۔ میرے خیال میں ان کا یہ مضمون اختصار اور جامعیت کے اعتبار سے نہایت اہم اور قابل قدر ہے۔ زبان عالمانہ مگر عام فہم ہے۔

الف لیلہ ولیلہ عربی کہانیوں کی مشہور زمانہ کتاب ہے جس کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں اصغر علی شاہ نے کتاب کے مآخذ، کتاب اور کہانیوں کے بارے میں تحقیقات اور مصنف کے بارے میں روایات کا تجزیہ کیا ہے۔ اس کے اُسلوب اور معروف کہانیوں کا بھی تذکرہ ہے۔ قصیدے کے بارے میں اصغر علی شاہ نے عربی فارسی اور اُردو قصائد کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔ قصیدے کا شکوہ الفاظ اور شوکتِ اظہار لسانی وفنی مہارت کی دلیل ہے قصیدے کو فنی کمالات کا مظہر سمجھا جاتا ہے۔

پروفیسر اصغر علی شاہ کی یہ کتاب چار مبسوط مضامین پر مشتمل ہے جن کے عنوانات مختلف ہیں مگر ان میں معنوی ربط موجود ہے۔ علم الاصوات اور علم العروض میں تعلق ہے۔ الف لیلہ ولیلہ کی لغوی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ قصیدے کو فنی محاسن صنائع و بدائع کا مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ چاروں مضامین ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ جس طرح نظامی عروضی سمرقندی کے چہار مقالہ کو شہرت حاصل ہوئی ہے اسی طرح مجھے اُمید ہے کہ پروفیسر اصغر علی شاہ کے اس چہار مقالے کو بھی پذیرائی حاصل ہوگی۔ پروفیسر اصغر علی شاہ کا اُسلوب مختصر، جامع اور عالمانہ ہے۔

☆☆☆

روش ندیم

نوجوان ادیب نسل کی کارکردگی: ایک تاثر

یوں تو ادیبوں شاعروں کے لئے لفظ ''نوجوان'' کا استعمال ایک ''حساس'' معاملہ ہے لیکن چونکہ ادبی اظہارات کی بالغ شکل پذیری عموماً تیس پینتیس سال کی عمر کے لگ بھگ سامنے آنے لگتی ہے۔ اس لئے وہ ادیب جو دو تین سالوں کے فرق کے ساتھ ساٹھ کے عشرے میں پیدا ہوئے آج وہ عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکے ہیں کہ انہیں اعتماد کے ساتھ ادیبوں کی نوجوان نسل میں شامل کیا جا سکتا ہے یہ نئے ادیب اب تک دو تین کتابوں کے ذریعے سے اپنی ادبی تخلیقات کو باقاعدہ طور پر منظر عام پر لا کر فنی و فکری سطح پر اپنا تعارف کروا چکے ہیں جبکہ ان سے سینئر نسل نے نہ صرف اپنا تخلیقی اور فکری تعارف و تشخص مکمل کر لیا ہے بلکہ اپنا تنقیدی و تخلیقی شباب گزار کر عمر کے ایسے مرحلے میں آ گئے ہیں جہاں ان سے کسی نئے تجربے یا اظہار کی توقع نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اب وہ یا تو اپنے طے شدہ رجحان پر ہی کسی حد تک آگے بڑھ سکتے ہیں یا محض تکرار کر سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر نسل اپنے سماجی سیاسی حالات اور رجحانات کے زیر اثر ایک نیا فکر و فلسفہ اور ادبی رجحان لے کر آتی ہے جو کہ نہ صرف نئے حالات کا نمائندہ ہوتا ہے بلکہ اس نسل کے Contribution کے ساتھ اس کے انفرادی تشخص کی بھی بنیاد بنتا ہے مثلاً حالی اور اس کے ہم عصر ایک نئی آواز کے ساتھ اردو ادب میں داخل ہوئے مگر ان کے بعد یلدرم والی نسل نے خود کو ان سے مختلف افکار کی حامل کے طور پر متعارف کرایا۔ کرشن، منٹو اور بیدی کی نسل اظہار و فکر کے نئے زاویئے اور اسالیب لے کر ادب میں وارد ہوئی۔ ان کے بعد ساٹھ کی دہائی کے جدیدیت پسندوں نے ادب میں نئے فنی و فکری مباحث کو رائج کیا گویا موجودہ سینئر نسل سمیت ہر عہد کے نوجوان ادیبوں نے شاعری، فکشن اور تنقید تینوں حوالوں سے اپنا مکمل حصہ ڈالتے ہوئے اپنی فکری و فنی انفرادیت کے واضح نقوش قائم کیے۔

موجودہ نوجوان ادیب نسل نے منٹو کے ہم عصروں کی طرح سماجی سیاسی حوالے سے ایک ہنگامہ خیز دور دیکھا ہے اس نسل نے اپنے شعور کی آنکھ جنرل ضیاء الحق کے دور میں کھولی جس کی بنیادیں جنرل پرویز مشرف تک آتے آتے پختہ ہو چکی ہیں اس دوران کا تمام زمانہ اس نسل کے شعور کا خام مواد بنا۔ اسلامی انتہا پسندی سے روشن خیال اعتدال پسندی تک، سرد جنگ سے یونی پولر دنیا تک، مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے افغانستان و عراق جنگوں تک، یہود و ہنود کی دشمنی سے ان سے آغاز دوستی تک، بلیک اینڈ وائٹ پی ٹی وی سے موجودہ گلوبل میڈیا تک کے حیرت انگیز تغیرات اسی زمانے کا حصہ ہیں۔ اتنے بڑے سماجی سیاسی مدوجزر پر مبنی منظر نامے کی حامل موجودہ نوجوان ادیب نسل پاکستانی اردو ادب میں کیا کردار ادا کر رہی ہے؟ ان کے Contribution کی سطح کیا ہے؟ ان کی فکری و تخلیقی انفرادیت کیا ہے؟

انہوں نے کون سے افکار و اسالیب کو متعارف کرایا ہے؟ ان کے ادبی مباحث اور ان کا مرکزہ یا بنیادی ایشو کیا ہے؟ ان کی فکر و تخلیقی انفرادیت اور خصوصیات کیا ہیں؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا سامنا اب نئی نسل کے لکھاریوں کو کرنا ہے اور اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

روزنامہ ''ایکسپریس'' کو دیئے گئے ایک حالیہ انٹرویو میں مبین مرزا نے کہا ہے کہ نئی نسل کے ادیبوں کی الگ سے کوئی فکری و فنی شناخت نہیں ہے بلکہ یہ اپنے سے سینئر نسل کا ہی تسلسل ہیں۔ اس بات کو مکمل طور پر رد کرنا بہر حال مشکل ہے کیونکہ عالمی حالات اور فکری دھاروں میں تغیر و تبدل اور سماجی و سیاسی حوالے سے قومی سطح پر اتھل پتھل کے منظر نامے میں نوجوان ادیب نسل نہ صرف اپنی کسی فکری انفرادیت کے باعث کوئی ہنگامہ خیزی پیدا نہیں کر سکی بلکہ ان کے ہاں تفکر کی دانشورانہ لہر بھی مقابلتاً کمزور دکھائی دیتی ہے اس بات کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ادبی رسائل و جرائد اور اخبارات کو موصول ہونے والی سب سے زیادہ ادبی صنف اور نئی کتابوں کی صورت میں چھپنے والا تخلیقی اظہار غزل کی صورت میں سامنے آ رہا ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنی و فکری سطح پر نیا غزل گو بطور Contribution کوئی نیا امکان ابھارنے میں ناکام ہے۔ نیا شعری منظر عمومی غزلیہ رجحان کو توڑنے میں ناکام نظر آتا ہے گو دو تین انفرادی مثالوں کے ذریعے سے اس بات کو رد کرنے کی کوشش ہو سکتی ہے لیکن معاملہ یہاں ایک نسل کے رجحان اور اسکے نمائندہ اسلوب کا ہے۔ اس صورتحال کے متوازی شاعری میں فنی و ہیئتی سطح پر ایک نیا ابھرتا ہوا رجحان نظم کا ہے جو اپنی طرف متوجہ کر رہا ہے لیکن نئی نظم کی فکری شناخت اور اس میں نئی نسل کے ورلڈ ویو کے منفرد اظہار کی پیشکش اور اسکی تشخیص اپنی جگہ ایک مسئلہ ہے جبکہ انہی دنوں کراچی میں ڈاکٹر سحر انصاری کی زیر صدارت ''اردو نظم کا زوال'' کے عنوان سے ایک سیمینار کا انعقاد بذات خود ایک دلچسپ اور قابل توجہ وقوعہ ہے۔ ادب میں فنی رجحانات کے ساتھ ساتھ فکر و دانش کا ٹھوس اور واضح اظہار شاعری کی نسبت نثر میں کسی حد تک زیادہ ہوتا ہے نئی نسل کے ہاں ادب کا یہ بازو پولیو کا شکار سا لگتا ہے سنجیدہ سماجی سیاسی نظریہ سازی اور تجزیہ نگاری کو تو خیر ایک طرف رکھیئے ذرا فکشن اور تنقید پر نگاہ دوڑایئے اور دیکھئے کہ کتنے نوجوان تسلسل کے ساتھ افسانہ اور ناول لکھ رہے ہیں اور کتنے نوجوان ادبی تنقید میں سنجیدگی سے کام کر رہے ہیں افسانہ نگاری پر نظر ڈالئے تو دو چار نوجوان ہی ملیں گے جنہوں نے افسانے کو اپنی کمٹمنٹ کا حصہ بنایا ہے ناول کے حوالے سے بھی اب تک پورے پاکستان میں نئے ادیبوں کے ہاں سے دو تین ناول تو مل جائیں گے لیکن ایک بھی ''ناول نگار'' نہیں ملے گا جو قرۃ العین حیدر یا عبداللہ حسین کی طرح سے ناول نگاری سے جڑا ہوا ہو۔ تنقید کا معاملہ تو بالکل ہی گیا گزرا ہے کبھی کبھار تنقیدی مضامین لکھ لینا یا مغربی تنقید کے تراجم پیش کر دینا تنقید نگاری نہیں کہلاتی۔ ہمہ گیر مطالعہ، تجزیاتی صلاحیت اور فلسفیانہ اندرز فکر کے ساتھ تنقید نگاری گہری داخلی جڑت اور اسے شناخت بنانے کا عزم رکھنے والے نوجوان نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ نئے ادیب اپنی ترجمانی کے لئے اپنا نمائندہ نقاد پیدا کرنے میں ناکام دکھائی

دیتے ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ بہر حال یہ مسئلہ فکر اور ورلڈ ویو کی انفرادیت اور تشکیل سے جڑا ہوا ہے۔

نئی ادیب نسل کے مندرجہ بالا تجزیے سے یہ مت سمجھا جائے کہ میں بھی اپنے چند بزرگوں کی طرح ادب کی موت یا حالت نزاع کا اعلان کرنے والا ہوں لیکن میں اس حوالے سے پریشان ضرور ہوں ممکن ہے کچھ ہمدرد میرے اس تجزیئے کو رد کرتے ہوئے چند عناصر کی نشاندہی کر کے کسی حوصلہ افزا صورتحال کی تشخیص کرنے کی کوشش کریں لیکن میں یہاں ایک نسل کے جداگانہ اور رجحان ساز فنی وفکری Contribution پر توجہ مرکوز کرنا چاہ رہا ہوں۔اس حوالے سے ایک نئی نسل کا اپنا وژن، زاویہ نظر اور زندگی کے حوالے سے ایک رہنما نقطہ نظر نہ ہونا بحیثیت قوم وتہذیب ہمارے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نئے ادیبوں کا اپنے سے سینئر ادیبوں سے یا آپس میں ہی کسی قسم کا واضح اور ٹھوس ٹکراؤ موجود نہیں ہے جو ان کی نظریاتی فکر اور فنی کشمکش کو سامنے لا سکے۔آج جب عالمی حالات کے دباؤ میں پچاس پچپن سالوں کے بعد ہمارے مشرقی دروازوں کو دوبارہ کھولا جا رہا ہے اور مغربی دروازوں پر سے روشن خیالی کے اعلان کے ساتھ بنیاد پرستی کے پردے ہٹائے جا رہے ہیں تا کہ گلوبل ولیج کے قیام کے لئے فری مارکیٹ اکانومی کی شاہراہوں کا قیام ممکن ہو سکے تو عالمی معشیت کا یہ نیا انتظام نئے عہد کے چیلنجوں کا پیش خیمہ ہے سوال یہ ہے کہ نوجوان ادیب نسل نئے منظر نامے کی نمائندہ بنتے ہوئے مشرق ومغرب کی آگے بڑھتی ہوئی دنیاؤں سے کن فکری بنیادوں پر مکالمہ یا لین دین کرے گی؟ کیا نوجوان ادیبوں کے پاس اس کا کوئی جواب ہے؟

☆☆☆

تنویر صاغر

ژونگ کے بارے میں چند فکری تحفظات: ایک جائزہ

اُردو کے تنقیدی دبستان میں ژونگ کے حوالے سے بہت ہی کم لکھا گیا ہے البتہ اس بات سے مفر نہیں کہ نفسیات کے شعبہ میں تحلیل نفسی کے مکتبۂ فکر، رموز اور فن سے امتزاج سے جن قدر شناسائی ژونگ کو حاصل تھی، وہ شاید ہی کسی کا امتیاز بن سکی ہو۔ مداحین ژونگ کے ساتھ ساتھ معترضین کا بھی ایک حلقہ موجود ہے، معترضین کے اعتراضات کی مختلف النوع جہات ہیں جن میں کچھ جذباتی، کچھ ذہنی وفکری کی ذیل میں آتے ہیں۔ان معترضین میں محمد حسن عسکری، سی اے، قادر اور سید علی عباس جلالپوری کے نام شامل ہیں۔

سر دست مذکورہ معترضین کے اعتراضات کی نوعیت اور حیثیت کا ادراک اور ابلاغ مقصود ہے۔

محمد حسن عسکری اردو ادب کے متغیر الفکر نقاد ہیں لیکن ژونگ پر تنقید کے سلسلے میں وہ مذہبی راست بازی اور صراط مستقیم پر چلتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے ژونگ کے نظریات اور فکر پر چند اعتراضات کیے ہیں جو یہاں پر ترتیب وار درج کر کے اس کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

۱۔ ''زر پرست دنیا کا پیغمبر فرائیڈ نہیں، ژونگ ہے۔ جس کا عقیدہ ہے کہ زر پرستی، جھوٹ، نمائش اور ریا کاری کے سماجی ماحول میں رہ کر بھی بلکہ اس ماحول سے سمجھوتہ کر کے بھی ذہنی صحت اور روحانی ترقی ممکن ہے۔۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ژونگ نے نفسیات کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کیا بلکہ۔ میں ژونگ سے شدید نفرت کرتا ہوں لیکن اس نفرت کے باوجود میں ژونگ کی کتابیں خریدتا رہوں گا، پڑھتا رہوں گا، ان سے فائدہ حاصل کرتا رہوں گا۔ فرائیڈ سے مجھے شدید محبت ہے لیکن میں نے اس کی کتابیں پڑھنا چھوڑ دی ہیں کیوں کہ مجھے نفسیات کے اس رُخ سے زیادہ دلچسپی ہے جدھر فرائیڈ کا باغی شاگرد اور عقیدت مند رائخ چلا ہے۔لیکن ژونگ کو جس طرح آگے بڑھایا جا رہا ہے وہ انسانیت، علم اور ادب بلکہ اخلاقیات کے لئے بھی ایک عظیم خطرہ ہے۔۔۔ فرائیڈ کی نفسیات ایک ذہنی اور سماجی انقلاب کے جراثیم لے کر آئی تھی۔ژونگ نے مصلحت پسندی اور شرافت اختیار کر کے نئی نفسیات سے ہی نہیں بلکہ علم کی روح سے غداری کی ہے۔نئی نفسیات جوہری قوت سے بھی زیادہ طاقت ور چیز تھی۔ژونگ نے اسے ایک پالتو بلی بنا دیا جو ادھیڑ عمر کی غیر شادی شدہ مالدار عورتوں کے پیر چاٹتی ہے''(۱)

۲۔ ''ژونگ کی نفسیات کے حوالے سے نہ تو انسان کو بھوک ستاتی ہے، نہ جنس۔

بس ذہنی تصویریں ہی پریشان کرتی ہیں'' (۲)

۳۔''ادب سے خالص جمالیاتی لطف حاصل کرنے کی صلاحیت کس میں زیادہ تھی اس کا اندازہ ایک اس بات سے ہوسکتا ہے کہ فرائیڈ نے اشعار کس طرح نقل کیے ہیں اور ژونگ نے کس طرح ژونگ صاحب نے ایسے اشعار چنے ہیں جن میں کوئی خیال، صراحتہ یا علامت کے ذریعے پیش کیا گیا ہو۔'' (۳)

اب ان نکات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ا۔عسکری صاحب نے اس اقتباس میں ژونگ پر اعتراض کرنے کے ساتھ ساتھ ژونگ کو اخلاقیات کے لیے عظیم خطرہ قرار دیا ہے اور ژونگ کو علم کے دائرہ کار سے باغی، غدار قرار دیا ہے اور ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ ژونگ کی کتابیں خرید خرید کر اُس سے مستفید بھی ہوتے رہیں گے۔ وہ اعتراض اور خطرے کے ساتھ ژونگ کی کتابیں خرید کر پڑھنے کو فائدہ بھی کہہ رہے ہیں اور خود یہ خطرہ مول لے رہے ہیں۔علم اور اخلاقیات کے لیے فرائیڈ خطرہ ہے اور نہ ہی ژونگ۔ ژونگ کے نظریہ ''اجتماعی لاشعور'' کی بنیاد یقیناً فرائیڈ کے نظریہ ''لاشعور'' پر ہی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فرائیڈ کا ''لاشعور'' جنسی جبلت تک محدود ہے جبکہ ژونگ کا ''اجتماعی لاشعور'' جنسی جبلت کے دائرہ کار سے بغاوت کر کے اساطیر، لوک کہانیوں، اور علامتی نفسیات تک لامحدود ہے۔ سو ژونگ کے لیے شدید نفرت کا لفظ استعمال کرنا اور اسے زر پرست دنیا کا پیغمبر کہنا، ایک جذباتی جملہ تو ہوسکتا ہے۔ مگر نظریاتی جملہ نہیں۔ کسی شخص کے فن سے تو اختلاف ہوسکتا ہے مگر اس شخص کی ذات سے اختلاف کس زُمرے میں؟

عسکری صاحب کے دوسرے اور تیسرے اعتراض کی مشترکہ جہت علامت ہے۔ عسکری صاحب کو ژونگ کی علامتی نفسیات، علامتی اہمیت سے بہت زیادہ چڑ ہے۔ شاید عسکری صاحب کی ژونگ سے شدید نفرت کا سبب صرف اور صرف علامت ہے یا ذہنی تصویریں ہیں۔ حالانکہ ژونگ کی نفسیات کے دائرہ کار کی حدود جنس سے بالا ہیں اور علامتیں، ذہنی مریض کے مرض کی تشخیص میں مددگار بھی ثابت ہوتی ہیں اور کسی بھی عام شخص کے ذہن کی تلازمی آزمائش کا ذریعہ بھی ہیں۔

سی، اے، قادر شخصیت کے خصائص اور ترتیب بیان کرتے ہوئے ژنگ پر یوں معترض ہیں۔

''ایک نقص جو ژونگ کی جماعت بندی میں ہے وہ یہ ہے کہ ہر آدمی کو یا تو بروں بیں یا دروں بیں سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں خصائص انتہا پر ہیں۔۔۔۔ لوگوں کی اکثریت کبھی انتہا پر نہیں ہوتی ان کا مقام توسط میں ہے۔ لہذا بروں بیں اور دروں بیں کے درمیان ایک تیسرا درجہ تسلیم کرنا پڑا ہے جسے دو بینی Ambiversion کہتے ہیں۔ یہ دونوں انتہاؤں کے درمیان ایسی منزل ہے جہاں وہ لوگ ہوں گے جو کچھ خصائص تو دروں بیں کے رکھیں گے اور کچھ

خصائص بروں بیں کے۔ اس منزل پر اکثر لوگ پائے جائیں گے۔'' (۴)

سی، اے، قادر کے مطابق انسان کی شخصیت بیک وقت دونوں خصائص یا پھر درمیانی حالت Ambiversion رکھتی ہے۔ جبکہ ایک شخص بیک وقت دونوں خصائص کا حامل نہیں ہوسکتا۔ ہاں البتہ یکسانیت کی بنا پر یا مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ایک شخص پہلے دروں بیں پھر بروں بیں یا پہلے بروں بیں پھر دروں بیں تو ہوسکتا ہے جو وقت کے ساتھ تغیر ہے اور ارتقاء کا اصول بھی ہے۔ مگر بیک وقت دونوں خصائص کا حامل نہیں ہوسکتا۔

عقلیت پسندی کے مکتبہء فکر کے مفکر سید علی عباس جلالپوری جو اُردو ادب میں فلسفہ کے پہلے شارح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون ''ژونگ'' میں ژونگ کے نظریات پر چند اعتراضات کیے ہیں۔ جو مندرجہ ذیل ہیں۔

ا۔ژونگ کا یہ کہنا کہ انفراد سے صرف ادھیڑ عمر کے لوگ ہی بہرہ ور ہو سکتے ہیں قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اس طرح انسانی عمر دو واضح وقاطع حصوں میں منقسم ہو کر رہ جاتی ہے جو حقائق کے منافی ہے۔ انفراد کے حصول کے لیے بچپن سے کوشش کا آغاز ہونا ضروری ہے لیکن ژونگ بچپن کی واردات کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ (۵)

۲۔''راقم کو ژونگ کے معترضین سے اس حد تک اتفاق ہے کہ ژونگ نے علمی تحقیق میں بے جا طور سمادھی، کرم، دھیان، چار کے ہند سے، تنتر ک منڈل، تاذکی ین اور یانگ کی دوئی، کیمیائی گری، علم نجوم، جادو اور مسیحی عرفان سے استناد کیا ہے اور ان نیم علمی، نیم صوفیانہ شعائر وتوہمات کو جو صدیوں کی تحقیق کے بعد بہ مشکل ان سے پیچھا چھڑایا ہے انہیں دوبارہ ذہن انسانی پر مسلط کرنے کی کوشش مستحسن نہیں ہوسکتی۔ ژونگ جدید انسان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ سائنس کی روشنی میں مردانہ وار آگے قدم بڑھانے کے بجائے صدیوں پہلے کے نیم صوفیانہ شعائر واوہام کی طرف لوٹ جائے'' (۶)

۳۔''مذہب کے اساسی عقائد تین ہیں۔ روح کا تصور، حیات بعد ممات اور خدا پر عقیدہ رکھنا۔ ژونگ تینوں کا ذکر استحسان سے کرتا ہے۔ اس نے خدا کو ''اجتماعی اصل عین'' کہا ہے۔ لیکن ژونگ کے پیرو بھول جاتے ہیں کہ اس نے اپنے لاادری ہونے کا صاف الفاظ میں اعلان کر دیا تھا۔ ظاہراً ایک لاادری کو ہم مذہبی آدمی نہیں کہہ سکتے ژونگ خود تو وجود باری، روح اور حیات بعد ممات کے بارے میں متردد ومشوش ہے اور ان پر ایمان کا مدعی نہیں لیکن

مریضوں کو اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ تم خدا، روح اور بقا پر عقیدہ رکھو گے تو شفایاب ہو جاؤ گے۔(۷)

اب ہم ان نکات کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ طفلیت، لڑکپن، شباب، بڑھاپا، فرد کی شخصیت کے چار ارتقائی مراحل ہیں ان میں پہلا اور آخری مرحلہ لاشعوری ہے۔طفلیت میں بچے کو ماحول میں موجود سوائے چند شبیہوں Images کے کسی دوسری شے میں امتیاز نہیں ہوتا اس لحاظ سے یہ لاشعوری مرحلہ ہے۔ویسے تو سب مرحلے ہیں لاشعوری ہوتے ہیں مگر طفلیت پہچان کے حوالے سے لاشعوری ہے۔اور کسی حد تک بڑھاپے میں بھی فرد لاشعوری طور پر انفراد کا حامل خود بخود ہو جاتا ہے۔ژونگ کے نزدیک یہ انفراد نہیں ہے جو بڑھاپے میں مرد کو باپ سے ماورا اور عورت کو ماں سے ماورا روپ یا صلاحیت عطا کرتا ہے جس سے ان کے باپ اور ماں کے چہرے نئی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔یہ بھی ان کی نفسیاتی الجھنوں میں شانتی کا باعث ہے۔

۲۔ ژونگ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے جیسا کہ علی عباس جلالپوری نے بیان کیا ہے بلکہ ژونگ کے مطابق انسان کو قدیم رسومات، لوک کہانیوں، قدیم مذہب اور اساطیر، ماضی کے حصوں کے ہمراہ اپنے حال کو گزارنا اور ماضی کی رہنمائی میں مستقبل کا تعاقب کرنا چاہیے۔ژونگ قطعی طور پر سائنسی ترقی یا جدید ترقی سے نالاں نہیں ہے بلکہ وہ ماضی کے گمشدہ اوراق کی رہنمائی اور دہرائی کے ہمراہ آج کے انسان کی ترقی کا خواہاں ہے۔

۳۔ مذہب ہر دور میں انسان کی ضرورت رہی ہے۔ژونگ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مذہب ہر اس انسان کی ضرورت ہے جو بے بس ہے۔نفسیاتی مریض جو مختلف نفسیاتی اُلجھنوں کا شکار ہے تو وہ ذہنی خلفشار اور انتشار کے حوالے سے بے بس ہے۔اس لیے مذہب، روح خدا، حیات بعد ممات پر اعتقاد اور ایمان، ہر بے بس (نفسی اُلجھنوں کے شکار شخص) کا شاید آخری سہارا ہے۔

مندرجہ بالا بحث کا لاشعوری احساس شاید ژونگ کو بھی تھا۔اس لیے اس امر پر گفتگو انہوں نے ایک انٹرویو میں یوں فرمائی: ''شاید ہی کوئی ایسا برا خطاب بچا ہو جس سے مجھے نہ نوازا گیا ہو، بلکہ پہلے تو دیوانہ سمجھ کر مجھ پر نکتہ چینی کی جاتی تھیں''

اِس جائزے اور معروضات کا مقصد محض یہ ہے کہ ایک عرصہ گزرنے کے ساتھ ساتھ، اگر غیر جانبدارانہ رویے سے ژونگ کے نظریات کو دیکھا جائے اور ان کا جائزہ لیا جائے تو نفسیات کے میدان میں اُس کی عظمت اور مقبولیت پہلے کی نسبت آج، مغرب میں کہیں زیادہ ہے اور ژونگ کا حلقۂ قرات یا متاثرین کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔مزید شہرت کا معاملہ قطعی طور پر عظمت سے ملحقہ نہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری یوں رقمطراز ہیں:

> ''ادیب کی قدر و قیمت کا یقین کرنے کے لیے سارتر یہ معیار مقرر کرتا ہے کہ ایسے انسان کی کتابیں پڑھ کر جب تک لوگوں کو غصہ آتا رہے، اُن کے اندر بے سکونی پیدا ہوتی رہے یا شرم و نفرت اور محبت محسوس ہوتی رہے تو وہ ادیب زندہ رہ سکے گا۔''

حوالہ جات

۱۔ محمد حسن عسکری، ''ژونگ اور جعلی روحانیت'' (مضمون) مشمولہ ''ساقی''، شمارہ اگست ۱۹۵۵ء، کراچی۔

۲۔ ایضاً

۳۔ ایضاً

۴۔ سی۔اے۔قادر، ژونگ کا نظریہ (مضمون)، ص۲۹۳، ۲۹۴، نفسیات، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۵ء۔

۵۔ سید علی عباس جلالپوری، ''ژونگ'' مضمون، ص۱۹۳، مقالات جلالپوری، نگارشات، لاہور۔

۶۔ ایضاً، ص۱۹۴۔

۷۔ ایضاً، ص۱۹۴، ۱۹۷۔

☆☆☆

پروفیسر مزمل حسین

ظفر اقبال کے کلام میں صنائع بدائع کا حُسن

(’آبِ رواں‘ کے تناظر میں)

علم بدیع بلاغت کی وہ شاخ ہے جس سے کلام میں ایسے معنوی اور لفظی محاسن پیدا کیے جاتے ہیں جو مقتضائے حال ہوتے ہیں اور کلام میں معنوی و لفظی پیچیدگی کی بجائے ایک خوشگوار تاثر پیدا کرتے ہیں۔ علم بدیع اپنے معنی کے مصداق، کلام میں اچھوتے پن اور نادرہ کاری کا باعث بنتا ہے۔ چونکہ یہ کلام کی آرائش و زیبائش لفظوں اور معنوں کے حوالے سے کرتا ہے اس لیے اس کو صنائع لفظی اور صنائع معنوی میں تقسیم کیا جاتا ہے اور یہ کلام میں جس بنیادی قدر کو جنم دیتے ہیں وہ بنیادی قدر ’’حُسن‘‘ ہے۔ بقول سید عابد علی عابد:

> ’’بدیع کی تعریف ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس علم کی قدر حسن ہے، یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ کلام میں عناصر جمال کی نشان دہی کرے اور تخلیق حسن کے گُر سکھائے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ علم بدیع عربی، فارسی اور اردو شاعری کے ہر دور میں مستقل رہا ہے۔ ویسے تو یہ علم دنیا کی دیگر زبانوں کے شعر و ادب میں دیکھا جا سکتا ہے لیکن اہلِ مشرق بطور خاص اس علم کے دلدادہ رہے ہیں۔ اردو شاعری کے بارے میں ایک مغالطہ یہ ہے کہ علم بدیع کا رواج فقط اردو کی کلاسیکی شاعری میں رہا ہے لیکن غور کرنے پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ دکنی عہد سے لے کر لمحہ موجود کی اردو شاعری میں علم بدیع کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حتیٰ کہ اردو کی نظمیہ شاعری اور دیگر ایسے شعرا جو جدید اور لسانی تشکیلات ایسی بحثوں میں الجھے رہے ہیں ان کے ہاں بھی ہم علم بدیع کی مثالیں دیکھ سکتے ہیں اور ان مثالوں سے اس علم کی توانائی کا اندازہ بھی ہو سکتا ہے۔

ظفر اقبال، عہد حاضر کا ایک معتبر غزل گو شاعر ہے۔ ان کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے شعری لسانیات میں تبدیلی کا نعرہ لگایا اور اپنے کلام میں بہت سی نئی لفظیات اور تراکیب کو متعارف کرایا۔ انہوں نے روایتی شعری لسانیات کی جگہ نئی لفظیات کا نہ صرف خود استعمال کیا بلکہ روایتی شعری لسانیات کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کیا۔ اس روش کے باوجود ہم ظفر اقبال کے ہاں علم بدیع کا روایتی استعمال بآسانی دیکھ سکتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے شعری مجموعے ’’آبِ رواں‘‘ سے بعض صنائع بدائع کی مثالیں دیکھیے:

مراعات النظیر

اس صنعت کو ائتلاف، تلفیق اور مواخات بھی کہتے ہیں۔ اصطلاح میں کلام میں چند ایسی چیزوں کا ذکر کرنا جن میں تضاد کے سوا کسی قسم کی مناسبت ہو۔ مثلاً باغ کے ذکر کے ساتھ گل، بلبل، بہار، خزاں، صیاد،

ندی اور باغبان کا ذکر کرنا۔ اس صنعت کے استعمال سے کلام میں معنوی حسن کے ساتھ ساتھ لفظی حسن بھی پیدا ہوتا ہے۔ مراعات النظیر کی اسی تفصیل کی روشنی میں ظفر اقبال کے ہاں اس کی چند مثالیں دیکھیے:

شب بھر رواں رہی گلِ مہتاب کی مہک
پو پھوٹتے ہی خشک ہوا چشمۂ فلک

شام تک ننھی پریاں طلسمی محلکوں میں دبکی رہیں
شام تک وادیِ قاف میں برف کے پھول گرتے رہے

یہ ایک شاخچۂ غم سے اتنے پھول جھڑے ہیں
کبھی قریب سے گزرو تو ایک باغ پڑا ہے

نجانے کب سے یہی گرمیوں کا موسم ہے
کڑکتی دھوپ ، دہکتی زمیں ، ہوا ساکن

پیاسا کوا جنگل کے چشمے میں ڈوب مرا
دیوانہ کر دیتی ہے پیڑوں کی مہکتی چھاؤں

غزالِ اشک سرِ صبح دُوبِ مژگاں پر
کب آنکھ اپنی کھلی اور لہو لہو نہ ملا

شبِ خمار تھی ، مے تھی ، بہار تھی ، لیکن
لپٹ کے سو رہے عکسِ فروغِ جام سے ہم

مزے کی بات ہے، اس کو بھجن سکھاتے ہیں
جو خود ہی مورتی ہے اور خود ہی مندر ہے

وہی ہے اپنے بھی سر میں خمارِ تیشہ طلب
ہمیں بھی راس نہ آئے گا کوہکن ہونا

ایہام

عام طور پر ایہام اور توریہ کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے حالانکہ دونوں کے معنی الگ الگ ہیں۔ ایہام کے معنی وہم میں ڈالنے کے ہیں اور توریہ کے معنی چھپانے کے ہیں لیکن علم بدیع کی اصطلاح میں یہ دونوں لفظ ایک ہی ذیل میں استعمال ہوتے ہیں یعنی کلام میں ایسا لفظ لانا جو دو معنی رکھتا ہو۔ ایک معنی

قریب اور دوسرے معنی بعید۔ ایہام میں کسی مخفی قرینے کی بنا پر لفظ کے معنی بعید مراد لیے جاتے ہیں لیکن گردوپیش میں ایسے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں جنہیں معنی قریب سے مناسبت ہو۔ اس طرح ذہن معنی قریب کی طرف ہی منتقل ہوتا ہے۔ وہم میں پڑنے کا جتنا امکان ہوگا ایہام اتنا ہی کامیاب سمجھا جائے گا اور کلام میں حُسن کا سبب بنے گا۔ اس حوالے سے ظفر اقبال کے ہاں ''ایہام'' کی مثال دیکھیے:

دل کا یہ دشت عرصۂ محشر لگا مجھے
میں کیا بلا ہوں ، رات بڑا ڈر لگا مجھے

دے کے دل خوش ہوں، چلو پاؤں سے کانٹا نکلا
تم نے تو ضد سے لیا تھا ، کہو کیسا نکلا

تجاہل عارف

بعض علمائے بلاغت نے ''تجاہل عارف'' کو تجاہل عارفانہ لکھا ہے۔ اصطلاح میں کسی خاص نکتے یا مقصد کے لیے، بات کو جاننے کے باوجود انجان بن جانا، صنعت تجاہل عارف کہلاتی ہے۔ یہ صنعت کلام میں لطیف احساس پیدا کرتی ہے، ظفر اقبال کے ہاں اس صنعت کا استعمال یوں ہوا ہے۔

مجھ میں یہ کون ہے ، اے حسرتِ تعمیرِ حیات!
تو نے جو نقش بنائے ہیں ، مٹائے نہ کہیں

صہبائے غم سے آج نہ ٹوٹا خمارِ خوں
ہے کس کے انتظار میں شمعِ شرار خوں

اندر کی آگ ، دیکھیے، روشن ہے یا نہیں
اٹھتا ہوا مکان کے سر سے دھواں تو ہے

دل کی صدا پکارتی ہے رات بھی کسے
کوئے سیہ میں شعلہ ملا بھی ، مگر کسے

صنعت تدبیج

یہ صنعت طباق کی ایک قسم سمجھی جاتی ہے جس کے لغوی معنی نقش کرنا، مزین کرنا، خوب صورت بنانا یا ریشمی کپڑے سے مزین کرنا کے ہیں۔ اصطلاح میں کلام میں رنگوں کا ذکر کرنا، صنعت تدبیج کہلاتی ہے۔ اس صنعت میں مطالب کو رنگوں کے ذریعے ایہام یا کنایہ کے پیرائے میں اجاگر کیا جاتا ہے۔ اس میں رنگ کتنے اور کیسے ہوں اس کی کوئی شرط نہیں لیکن رنگ ایک سے زیادہ ہوں اور ان میں تقابل اور تضاد کی صورت موجود ہو۔ ظفر اقبال کے کلام میں صنعت تدبیج کی مثالیں ملاحظہ کیجیے:

سفید ، سرخ ، سیہ ، سانولا ، سلیٹی ، سبز
ہزار رنگ میں چمکے گا درمیاں جو ہوا

چمک جھمک رہے ہیں سرخ ، زرد ، سرمئی مکاں
کھلی ہیں کھڑکیاں، کھڑی ہیں تاب کار صورتیں

سب سنہرے ، سبز جنگل کی فضا میں کھو گئے
رخ نہیں کرتا کوئی اجڑے ہوئے گھر کی طرف

تجنیس ناقص وزاید

کلام میں دونوں متجانس الفاظ میں سے ایک لفظ میں ایک حرف دوسرے لفظ سے زائد ہو تو اسے تجنیس ناقص یا تجنیس زاید کہا جاتا ہے۔ مثلاً

سرخوشِ خواب رہو گے کب تک
شہر بھر جاگ اُٹھا ، اُٹھ بیٹھو

گزر نہ جا مرے دل کے دیار سے چپ چاپ
عجیب دشت ہے یہ، اس میں خاک اُڑا تو سہی!!

بن سنے برسا رہے ہیں داد بھی ، بیداد بھی
حاتمِ دوراں ہیں اپنے دور کے نقاد بھی

صنعت تجنیس مُزَیّل

مُزَیّل کے لفظی معنی ہیں مٹانے والا، کسی چیز کے آثار دور کرنے والا۔ علم بدیع کی اصطلاح میں یہ تجنیس کی وہ قسم ہے جس میں دو متجانس الفاظ اس طرح استعمال کیے جاتے ہیں کہ شعر میں ایک لفظ کے شروع یا آخر میں ایک سے زائد حروف زاید ہوں، مثلاً

ٹوٹے گا کس سے گھومتی آواز کا طلسم
سرگوشیاں اگر اسی رَو میں رواں رہیں

پانی کی سیہ ، سانپ سی لہراتی ہوئی لہر
ڈس لے تو اسی زہر کا تریاک سمندر

چاند کی چاندنی دیتی ہے قرار آنکھوں کو
دل کی موجوں کو مگر زیر و زبر رکھتی ہے

صنعت تجنیس محرف

اگر تجنیس میں دونوں متجانس الفاظ حروف کی تعداد، ترتیب اور شکل کے اعتبار سے یکساں ہوں لیکن اعراب (زیر، زبر، پیش وغیرہ) کے حوالے سے یکساں نہ ہوں تو اسے تجنیس محرف کہا جاتا ہے۔ مثلاً

زباں کا ذائقہ بدلے تو کچھ نظر آئے !!
ہوا ہی پھانک رہا ہوں ، مگر دھواں جو ہوا

یہ سب ہیں کہنے کی باتیں ، میں لا مکاں بھی سہی
کیا ہی کیا ہے اگر اس کے دل میں گھر نہ کیا

سنا گیا ہوں فسانے اِدھر اُدھر کے ظفر
پتے کی بات نہ کی، قصہ مختصر نہ کیا

صنعت تجنیس خطی

اگر تجنیس میں دونوں متجانس الفاظ حروف کی تعداد، ترتیب اور ماہیت کے حوالے سے ایک سے ہوں مگر نقطوں کے لحاظ سے مختلف ہوں تو اسے تجنیس خطی کہا جاتا ہے۔ مثلاً

کیا ماہتاب تھا کہ ظفر جس کے رو برو
زیر و زبر ہوا ہے یمِ بے کنارِ خوں

صنعت تجنیس مضارع

اصطلاح میں یہ صنعت تجنیس کی ایک ایسی قسم ہے جس میں الفاظ متجانس میں ایک حرف مختلف ہو مگر وہ متحد المخرج یا قریب المخرج ہوں اور ان حروف کا اختلاف آغاز، درمیاں یا آخر میں ہو سکتا ہے۔ مثلاً

چمک جھمک رہے ہیں سرخ، زرد، سرمئی مکاں
کھلی ہیں کھڑکیاں، کھڑی ہیں تاب کار صورتیں

صنعت اشتقاق

اشتقاق، اصطلاح میں اس سے مراد یہ ہے کہ کلام میں دو ایسے لفظ لائے جائیں جن کا ماخذ اور اصل ایک ہو اور دونوں الفاظ باعتبار معنی بھی متفق ہوں۔ مثلاً

مانا، گل و گلزار پہ رعنائی وہی ہے
منظر تو بدل دے کہ تماشائی وہی ہے

صنعت ردالعجز علی الصدر

شعر کے پہلے مصرع کے شروع (صدر) میں آنے والا لفظ اگر مصرع ثانی کے جزو آخر (عجز)

میں آئے تو وہ صنعت ''ردالعجز علی الصدر'' ہوگی۔ مثلاً

مجھے خبر ہے کہ تو خود ہی اپنا زنداں ہے
فریب دے نہیں زنجیر کی صدا کے مجھے

صنعت ردالعجز علی الابتدا

شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں وہی لفظ لانا جو اس کے شروع میں آیا ہو۔ یعنی مصرع ثانی کی ابتدا اور انجام میں ایک لفظ کا آنا ''صنعت ردالعجز علی الابتدا'' کی کیفیت کو ثابت کرے گا۔ مثلاً

کچھ پتا چلتا نہیں یہ آسماں ہے یا زمیں
تھا ، مگر اتنا یہ نظارہ تہ و بالا نہ تھا

صنعت ردالعجز علی الحشو

جو لفظ شعر کے عجز میں آئے وہی شعر کے حشو میں آئے۔ مثلاً

اسی سے آئے ہیں آشوب آسماں والے
جسے غبار سمجھتے تھے کارواں والے

صنعت تلمیح

تلمیح عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی، اشارہ کرنا یا اچٹتی نگاہ ڈالنا، کے ہیں۔ اصطلاح میں کلام میں کسی مشہور واقعے یا مسئلہ، روایت، قصے، شخص، چیز، جگہ، شعر، حدیث، قرآنی آیت یا کسی علمی و فنی اصطلاح کی طرف اشارہ کرنا تلمیح کہلاتا ہے۔ ظفر قبال کے ہاں بھی تلمیحات کا استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

وہی ہے اپنے بھی سر میں خمارِ تیشہ طلب
ہمیں بھی راس نہ آئے گا کوہکن ہونا

ناچیز ہے صد مُہرِ سلیماں مرے نزدیک!
بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل میں

تجھے اٹھائے گی کیا فکرِ فتنۂ فردا !
کہ تیرے سر میں ابھی نشۂ الست بھی ہے

صنعت جمع

کلام میں چند چیزوں کو اکٹھا کرنا، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ چیزیں ایک حکم کے تحت اکٹھی ہوں اور ان چیزوں کا باعتبار معنی آپس میں ربط ہو۔ مثلاً

وقت بتلائے گا اک روز تجھے میں کیا ہوں !
آگ ہوں، راکھ ہوں، خورشید ہوں، یا ذرہ ہوں

نجانے کب سے یہی گرمیوں کا موسم ہے
کڑکتی دھوپ ، دہکتی زمیں ، ہوا ساکن

صنعت طباق یا تضاد

اس صنعت کو مطابقت، تطبیق، تکافو، تقابل ضدین، تناقض، طباق یا متضاد کہتے ہیں۔ اصطلاح میں، کلام میں دو ایسے الفاظ استعمال کرنا جو معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں خواہ دونوں اسم ہوں یا دونوں فعل یا دونوں حرف ہوں یا ایک اسم ہو اور ایک فعل۔ اس حوالے سے ظفر اقبال کے کلام سے چند مثالیں دیکھیے:

کس جستجو میں جسم جلاتے ہیں رات دن
سچ پوچھیے تو اس کی ہمیں بھی خبر نہیں

خوشی ملی تو یہ عالم تھا بد حواسی کا
کہ دھیان ہی نہ رہا غم کی بے لباسی کا
یہ قُرب ہی فاصلہ ہے اب کے
سو کوس ہیں شاخ سے شجر تک

صنعت مبالغہ

علم بدیع کی اصطلاح میں کسی چیز کی مدح یا مذمت کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے کہ عام حالات میں کسی چیز کی تعریف یا اس کی مذمت کا اس حد تک پہنچنا محال یا بعید از قیاس ہو۔ اس تعریف کی روشنی میں ظفر اقبال کے ہاں مبالغہ کی مثالیں دیکھیے۔

کانچ کا شہر ہوں ، دم بھر میں اجڑ جاؤں گا
فرصتِ شوق غنیمت ہے ، سجالے مجھ کو ! !

وہ آنکھ ہے کہ جسے چوم کر لرز جاؤں
وہ زلف ہے کہ اڑا دے دھواں بنا کے مجھے

صنعت حسن تعلیل

یہ صنائع معنوی کی ایک دلکش صنعت ہے۔ اس کا استعمال شاعر کے گہرے فنی شعور کی دلیل ہے۔ تعلیل عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی علت (سبب) یا وجہ بیان کرنا اور توجیہ پیش کرنا کے ہیں۔ ادبی اصطلاح میں صنعت حسن تعلیل سے کسی بات کی ایسی علت یا سبب بیان کرنا مراد ہے جو اس کی اصل علت، وجہ یا سبب تو نہ ہو لیکن یہ اس طرح بیان میں آئے کہ اس سے کلام میں کوئی شاعرانہ خوبی پیدا

ہو جائے اور اسے پڑھ کر یا سن کر لطف آئے اور قاری یا سامع خوب حظ اٹھائے۔ اس صنعت میں شاعر ایک حقیقت کا ایسا خیال یا تخیلاتی سبب بیان کرتا ہے جو نہ صرف دلچسپ، پر لطف اور بلیغ ہوتا ہے بلکہ اس سے شاعر کے تخیل کی رفعت، خیال کی ندرت اور فکر کی جدت بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس طرح شاعری میں ایسی بہت سی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں جو کسی اور طریقے سے شاید پیدا نہ ہو سکیں۔ ظفر اقبال کے ہاں بھی اس صنعت کا استعمال ہوا ہے مثلاً

مکاں لرزتے رہے سیلِ غم گزر بھی گیا
چڑھا ہی تھا ابھی دریا ابھی اتر بھی گیا

صنعت تعجب

تعجب کے لغوی معنی انوکھا پن، حیرت اور اچنبھا کے ہیں۔ اصطلاح میں تعجب کی کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شعر مہہ نکتے کی خاطر کسی بات پر اظہار تعجب کیا جائے اس حوالے سے ظفر اقبال کے ہاں ایک مثال دیکھیے۔

ظفر کی خاک میں ہے کس کی حسرتِ تعمیر
خیال و خواب میں کس نے یہ گھر بنایا تھا

صنعت تنسیق الصفات

تنسیق الصفات، حسن النسق سے ہے، علم بدیع کی اصطلاح میں، کلام میں کسی شخص یا چیز کی کئی صفات بیان کرنا۔ یہ صفات منفی بھی ہو سکتی ہیں اور مثبت بھی یعنی یہ صفات مدح کی ہوں یا ذم کی، تنسیق الصفات کی ذیل میں آئیں۔ شرط یہ ہے کہ یہ صفات مسلسل بیان کی گئی ہوں۔ مثلاً

پھر جا رُکے گی بجھتے خرابوں کے دیس میں
سُونی ، سلگتی ، سوچتی ، سنسان سی سڑک

وقت بتلائے گا اک روز تجھے میں کیا ہوں
آگ ہوں، راکھ ہوں، خورشید ہوں یا ذرہ ہوں

ترافق

ترافق کا لغوی معنی ہے ایک دوسرے کا ساتھی ہونا۔ علم بدیع کی اصطلاح میں، کلام کے مصرعے اس طرح کے ہوں کہ جس کو چاہیں مصرع اول، دوم، سوم یا چہارم کر لیں۔ یہ عمل شعر کے دونوں مصرعوں، قطعہ، رباعی یا مسدس کے مصرعوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے اور اس عمل سے معنوں میں یا سلاست اور روانی میں کوئی فرق نہ آئے۔

کچھ بادِ تند کا ہے یہاں زور بھی بہت
کچھ یار ہیں مچائے ہوئے شور بھی بہت

اس شعر میں اگر مصرع ثانی کو پہلے مصرعے کی جگہ لے آئیں تو شعر کے معنی، سلاست اور روانی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

صنعت تکرار

تکرار کے لغوی معنی دہرانا یا بار بار کرنا کے ہیں۔علم بدیع کی اصطلاح میں صنعت تکرار اُس صنعت کو کہتے ہیں جس کے تحت شعر یا مصرع میں کسی لفظ کو تاکید یا زور دینے کے انداز میں مکرر لایا جائے۔مصنف بحرالفصاحت نے اس کی سات اقسام بیان کی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں: تکرار مطلق، تکریر مثنیٰ، تکریر مشبہ، تکریر ستائف، تکریر مع الوسطہ، تکریر مولکر اور تکریر حشو، اس صنعت سے کلام میں زور، تاثیر اور صوتی حُسن پیدا ہوتا ہے۔مثلاً

یہ نرم نرم گھاس ، یہ پھولوں بھری زمیں
اک دن بہا تھا خون کا دریا یہیں کہیں

سہا سہا ہے سجاوٹ میں ترا سانولا پن
سرخیٔ لب ہے کہ ہے شعلۂ شب گیر کوئی

جھوٹی خوشی سہی ، وہ کہیں دیکھتا نہ ہو
یوں زور زور سے نہ ہنسو ، سن رہا نہ ہو

مبادلۃ الراسین

یہ وہ صنعت ہے جس کے تحت کلام کے دو لفظوں کے ابتدائی حروف کا باہم تبدیل ہو جانا۔مثلاً ظفر اقبال کے اس شعر کے ان لفظوں کے ابتدائی حروف ش اور ح میں اس طرح تبدیلی آئی ہے:

شجر حجر سبھی چپ سو گئے تو آخرِ شب
غزال غم کا شکاری بھی گھات سے نکلا

مذکورہ صنعتیں، ظفر اقبال کے صرف ایک مجموعہ کلام ''آبِ رواں'' سے اخذ کی گئی ہیں اگر ہم ظفر اقبال کے دیگر کلام کو بھی اس مضمون کا حصہ بناتے تو یقیناً ان کے ہاں اور بھی بہت سے صنائع لفظی و معنوی سامنے آتے۔اس بات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ علم بدیع اردو شعری تاریخ کے ہر دَور میں مستعمل رہا ہے کبھی شعوری کوشش سے اور کبھی لاشعوری طور پر علم بدیع کا استعمال ہوا ہے۔یعنی ہم کہہ سکتے

ہیں علم بدیع اُردو شاعری کی روایت کا حصہ ہے۔اُردو شاعری کے ابتدائی ادوار، جن میں ایہام گوئی کی تحریک، میر و سودا کا دَور، آتش و ناسخ کا عہد اور انیس و دبیر کا زمانہ آتا ہے۔اس میں صنائع لفظی و معنوی پر خصوصی توجہ رہی اور جہاں پر بطور خاص شعوری کوشش سے صنعتوں کا استعمال ہوا وہاں معنی کی راہ میں کچھ روکاوٹیں بھی آئیں لیکن جہاں صنعتوں کا استعمال برجستہ، رواں اور لاشعوری طور پر ہوا ہے وہاں شعری حُسن میں اضافہ ہوا ہے۔اس کی نمایاں مثال غالب اور بعد میں اقبال کی شاعری ہے ان دونوں رجحان ساز شعرا کے ہاں صنائع لفظی و معنوی کا کثرت سے استعمال ہوا ہے۔چونکہ یہ استعمال غیر محسوس انداز میں ہے اس لیے شعر کے بنیادی حُسن میں کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی بلکہ ان صنعتوں کی موجودگی سے ان شعرا کے کلام کے حُسن میں ہر طرح سے اضافہ ہوا ہے۔اگر آج بھی ہم اُردو کے جدید اور اہم شعرا کے ہاں صنائع لفظی و معنوی کی صورت حال دیکھیں تو یہ خوشگوار حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں اور ان صنعتوں کا مطالعہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ صنعتیں کسی شعوری کوشش یا محض انفرادیت حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوئیں بلکہ یہ علم بدیع کی باطنی طاقت کا ثبوت ہے کہ ہر ایسا شاعر جو اُردو شعری روایت کا شعور رکھتا ہے اُس کے ہاں اس علم کا ایک سنبھلا ہوا اور صحت مند استعمال ہوا ہے۔ظفر اقبال بھی آج کے اُن غزل گو شعرا میں شامل ہیں جن کی غزل اُردو شعری روایات سے مملو ہے اسی لیے ان کے ہاں علم بدیع مخل معانی ہونے کے بجائے معاون معانی ہے کیونکہ انہوں نے بھی صنائع لفظی و معنوی کو برجستگی اور روانی سے غیر محسوس انداز میں استعمال کیا ہے اور یہی انداز اُن کے کلام میں صنائع لفظی و معنوی کے حُسن کا سبب بنا ہے۔

اخذ و استفادہ

۱۔ اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی، کلید بلاغت (لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، سن ندارد)
۲۔ خورشید حسین بخاری، تاج فصاحت و بلاغت (لاہور: تاج بک ڈپو، سن ندارد)
۳۔ ساجد اللہ تفہیمی، فرہنگ اصطلاحاتِ علوم ادبی (اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران، پاکستان، ۱۹۹۶ء)
۴۔ ظفر اقبال، آبِ رواں (لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۵ء)
۵۔ سید عابد علی عابد، اصول انتقاد ادبیات (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء)
۶۔ نجم الغنی، مولوی، بحرالفصاحت جلد دوم (لاہور: مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)
۷۔ وہاب اشرفی، پروفیسر، تفہیم البلاغت (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۹ء)

☆☆☆

سیّدہ سیفو

ظفؔر اقبال کی شاعری۔ایک تاثر

ابنِ ابی حدید نے شرح نہج البلاغۃ میں علی ابن ابی طالب کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ کَلَامُ الاِمَـامِ اِمَـامُ الـکَلام (امام کا کلام کلام کا امام ہوتا ہے) کیونکہ علی ابنِ ابی طالب نے اس وقت کے تمام شعرا، فصحاء اور البلغاء کو اپنے کلام سے حیرت زدہ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے اسی زبان کی کئی نئی جہتیں کھولیں اور لفظوں کو اس طرح استعمال کیا کہ اس سے پہلے اس طرح کا استعمال کبھی نہ ہوا تھا جس نے کلام کے کچھ نئے معنی وضع کیے آج بھی کلامِ علی میں لفظوں کا استعمال قاری کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔

ظفر اقبال کو بھی جدید اردو شاعری کا امام کہا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک طرف ظفر اقبال نے زبان کے بندسیل زدہ دروازے وا کیے وہاں ان کا کلام اپنے اندر ایک بھرپور تازگی اور نیا پن لیے ہوئے ہے۔ ابلاغ کے لیے دنیا کے بیشتر لوگوں کی مدد زبان کرتی ہے مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں کہ جو زبان کی مدد کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے من کے سمندر معنی والفاظ سے بھرے ہوئے ہیں ان کا رویہ زبان کے ساتھ ایک ہمسفر کی مانند ہوتا ہے اور وہ زبان کے ان تمام راستوں کا سفر کرتے ہیں جو کہ متروک ہو چکے ہوتے ہیں نیز وہ زبان کے نئے امکانات کو بھی تخلیقی سطح پر روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ ہر زبان ایسے آنے والوں کا انتظار کرتی ہے اور یہی لوگ تخلیق کا رخ متعین کرنے والے ہوتے ہیں۔

ظفر اقبال بھی افقِ شاعری پر اردو کی بانہوں میں بانہیں ڈالے ایک دلنواز محبوبہ کی طرح اسے عشق اور تجربے کے نئے راستوں پر لے کر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں ہماری ظاہری شخصیتیں اپنے اوصاف کے سبب اپنا ایک خاص تاثر چھوڑتی ہیں اور اپنے رویے سے ایک خاص پہچان رکھتی ہیں وہاں شاعری بھی اپنا تاثر ایک جیتے جاگتے انسان کی مانند ہی چھوڑتی ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہے اور ہجومِ کلام میں ہم اسے باآسانی الگ شناخت کر سکتے ہیں۔ مادی اشیاء کی نسبت لفظ اپنا راستہ جلدی طے کرتا ہے اور لفظ کا بہترین استعمال اس کو تیر کی تیزی دیتا ہے اور یہی تیزی ظفر اقبال کے کلام میں ہے کہ ان کا ہر ایک شعر اپنے اندر نہایت آسانی سے دل کے اندر تک اُتر جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

چند ایک خصوصیات جو کہ ایک پڑھنے والے پر بہت جلد واضح ہوتیں ہیں ان میں ان کے کلام کی تر و تازگی اور نیا پن ہے۔ ان کا کلام ان کے پڑھنے والے کو اپنے ساتھ تازہ کھلے ہوئے پھولوں کے اس گلشن میں لے جاتا ہے جہاں ہر طرف خوشبو ہی خوشبو اور نیا پن ہے۔ جہاں کوئی پرانی چیز نہیں ہے اور کسی بھی پھول پر ماضی کا کوئی نشان نہیں ہے۔ ہر پھول بس ابھی شاخِ شاعری پر کھلا ہے اور اپنا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

اردو شاعری میں جو الفاظ، مضمون اور رویے کی کہنگی تھی ظفر اقبال نے اس کو ختم کر دیا۔ انہوں نے ہر پرانے خیال کو نئے الفاظ کا جامہ اس طرح پہنایا کہ پڑھنے والا خود کو ایک نئی دنیا میں محسوس کرتا ہے۔ ان کا ہر شعر قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے اس کمزور رویے کو بھی ختم کیا کہ جو غزل کی پہچان کسی ایک شعر کو کہتے تھے۔ ظفر اقبال کا ہر شعر غزل میں جڑے ہوئے نگینوں کی مانند ہوتا ہے اور ایک تسلسل کے ساتھ غزل میں اپنی اہمیت رکھتا ہے۔

چراغ سا جو کسی بت کدے میں بجھتا ہوں
دھواں دریچۂ محراب سے نکلتا ہے

اور کر سکتا وہ اس شام کا پہلو روشن
موجۂ ماہ میری اور طرف سے آتا

میں بہت دیر سے بیٹھا تھا کہیں آئینہ سا
دفعتاً اس کے جھلکنے کی صدا آئی مجھے

صبح کو روک رکھا تھا کہیں اس نے بھی ظفؔر
ہم نے بھی ڈال دیا اس کے گریبان میں ہاتھ

ظفر کا شعری انداز بالکل جدا، اظہار بہت خوبصورت اور استعمال نہایت مناسب ہے۔ وہ بھاری پن اور کہنگی جو شاعری کو مصیبت جان بنا دیتی ہے ظفر اقبال نے اس کو ختم کر دیا۔ ان کا ہر شعر دل بردستِ ہمدرد کی مانند لگتا ہے۔

ایک خاص رویہ جو ہمیں نظر آتا ہے وہ ظفر اقبال کا غزل کے آخری شعر میں خود کو مخاطب کرتے ہوئے طنزاً اور ایک ادائے محبوبی کے ساتھ کوئی بات کہنا ہے۔ اس کا اثر اس طرح ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس شعر پر رُک سا جاتا ہے۔ ان کا آخری شعر ایک خاص طنز، بے نیازی اور سوچ سے بھرپور ہوتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

میری غزل پہ ظفؔر ان کے سر ہلیں کیونکر
طریقِ خاص میں لطفِ مذاق عام کہاں

بہہ گئے مضمون و معنی تند موجوں میں ظفؔر
اور اب کتنی طبیعت کو روانی چاہیے

بات بے بات بگڑ بیٹھتے ہو اس سے ظفؔر
اس طرح سے تو محبت نہیں کی جا سکتی

عام اور روایتی مضامین کو ظفر اقبال اپنے نئے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ اس پرانی سوچ کے پہلو سے کئی نئے معنی نکلتے ہیں، اظہار کا یہ خوبصورت، معصومانہ اور جداگانہ انداز ان اشعار میں دیکھیں۔

رہی نہ تھی وہاں میری بھی کوئی گنجائش
مکانِ تنگ میں اُس رات اس قدر کوئی تھا

یہ کیا کہ صبح کو رہ جائے پھر بھی تو باقی
میں اپنے آپ سے شب بھر تجھے نکالتا ہوں

ظفر اقبال کی شاعری آپ کے احساسات کو ممیّز کرتی ہے۔ چہرے پہ مسکراہٹ، آنکھوں میں آنسو اور ذہن میں سوچ لاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کوئی ہمارے سامنے بیٹھا ہم سے ہمکلام ہے جو ہمیں ہنساتا ہے رُلاتا ہے، بحث کرتا ہے، دلیلیں دیتا ہے اور ایک ہمدرد کی طرح کندھے پر ہاتھ بھی رکھ دیتا ہے اگر کوئی شاعری پڑھتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑے تو اس کے ہاتھ میں ظفر اقبال کی ہی کتاب ہوگی۔

یوں تو سنتا نہیں وہ بات ظفر
لکھ غزل اور سر پہ اس کے پٹخ

کہے گا وصل اس کو کون کنجر
ہوا ڈھیلا کوئی انجر نہ پنجر

ایک خاص وصف ظفر اقبال کی شاعری میں بڑی خوبصورت اور مہذبانہ انداز میں طنز کی تیزی ہے۔ ظفر اقبال نہایت چبھتی ہوئی بات کو بڑے آسان اور رواں انداز میں کہہ جاتے ہیں۔

کتنی دیر پتنگ بنا کر ہم نے آج اڑائی روٹی
پُرسے کو آیا تھا ظفر اپنا رونا رو گیا

ایک اور وصف ان کی شاعری کا تسلسل اور روانی ہے۔ اُن کی غزلیں بہتا ہوا دریا ہیں، جو لہر لہر آگے کی طرف جا رہا ہے اور پڑھنے والا اس روانی کے ساتھ خود کو بھی اس دریا کے سپرد کر دیتا ہے۔ اس غزل میں موجود روانی اور تسلسل ایسا ہے جیسے کہ صاف شفاف بہتا ہوا پانی۔

پاس ہونے بھی نہ دے ہونٹ بھگونے بھی نہ دے
شور کرتا ہوا دریا مجھے سونے بھی نہ دے

بارشوں کو بھی الگ رکھا ہے اور اب
دل کی دیوار پہ لکھا ہوا دھونے بھی نہ دے

ظفر اقبال کا ہجر و وصل کا اندازِ بیاں نہایت جداگانہ ہے۔ اک تازگی اور نیا پن ان میں بھی جھلکتا ہے۔ وہ عام عاشق نامراد کی طرح خود کو محبوب کی جوتی اور معشوق کو خدا نہیں سمجھتے بلکہ انسانی سطح پر اس

معاملے کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایتی عشق اور محبوب نہیں بلکہ انہوں نے یہ معاملات ایک شائستہ اور پڑھے لکھے انسان کی مانند نہایت نازک اور خوبصورت انداز میں بیان کیے ہیں۔ خصوصاً وصل کو اس خوبصورتی سے بیان کیا کہ پڑھنے والا اسے اپنے ہی دل کی واردات سمجھتا ہے۔

بدن کا سارا لہو کھینچ کے آ گیا رُخ پر
وہ ایک بوسہ ہمیں دے کے سرخرو ہے بہت

کہیں ملے تو سہی وہ شگفتہ لب ہم کو
کچھ اس سے بات کریں چومتے طریقے سے

روبرو کر کے کبھی اپنے مہکتے سرخ ہونٹ
ایک دو پل کے لیے گلدان کر دے گا مجھے

آہٹ آتے ہی نگاہوں کو جھکا لو کہ اُسے
دیکھ لوگے تو لپٹنے کو بھی جی چاہے گا

ظفر اقبال ان رویوں کو بڑے خوبصورت انداز سے شعری قالب میں ڈھالتے ہیں جو ہمیں اکثر اِردگرد نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری بہت نیچرل احساس دیتی ہے۔

دیتے ہیں اُدھار اس دکان پر لیکن ذرا تولتے ہیں کسا
عربی فارسی کا ایم اے ہوں ساگ کو کہنا چاہتا ہوں سعاغ
اُصول توڑتے گزری ہے اور باقی عمر گزارنی ہے اُصولوں کی پاسداری میں
دہشت خلق ہی اتنی تھی ہمارے ہرسمت ہم نے گھبرا کے ظفر خوفِ خدا چھوڑ دیا

ظفر اقبال صرف یہی نہیں ہے بلکہ

رکا ہوا کوئی سیلاب ہوں طبیعت کا
ہمیشہ تندیٔ رفتار سے نکلتا ہوں

ان کی شاعری کی بہت سی جہتیں ہیں اور کئی اعتبار سے یہ پڑھنے والے پر اپنا اثر چھوڑتی ہے جو ایک دفعہ ظفر اقبال کی شاعری کو چکھ لے وہ پھر کسی اور شاعری سے اپنی تسلی نہیں کر سکتا۔ یہ ایک نشہ کی مانند ہے۔ اتنی روانی اور بے نیازی کسی اور شاعر کے ہاں نہیں ملتی۔

مجھے یقین ہے کہ اہلِ دل اور اہلِ شعور اس شاعری کو اپنے دل و دماغ کے تختِ اولیٰ پر ضرور بیٹھائیں گے اور آنے والا دور دورِ ظفر ہوگا۔ معیار اور مقدار کا اعلیٰ امتزاج صرف اور صرف ظفر کے ہاں ملتا ہے۔ ہم آنے والے دِنوں میں ظفر اقبال پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں کیونکہ بہت عرصہ بعد اردو شاعری کو امام نصیب ہوا ہے۔

☆☆☆

ظفر اقبال

پھول پتے ، چاند سورج تھے جہاں آواز تھی
وہ زمیں آواز تھی یا آسماں آواز تھی

تازہ کر دیتی تھی مرجھائے ہوئے اس جسم کو
اس طرح کی وہ بہارِ بیکراں آواز تھی

رات بھر جاری تھا آبِ خواب پر میرا سفر
بے سروسامانیوں میں بادباں آواز تھی

اپنے ہونے کا یقیں رہتا تھا مجھ کو دمبدم
بے بسی میں بھی وہ ایسی مہرباں آواز تھی

ایک خوشبودار ، ہلکا سا اشارہ ، اور پھر
میں ہمہ تن گوش تھا ، اور بعد ازاں آواز تھی

کچھ مجھے اُس کا یقیں بھی ٹھیک سے آتا نہ تھا
وہم کی تصویر تھی وہ ، یا گماں آواز تھی

میرے کانوں اور آنکھوں کو بھلی لگتی تھی جو
وہ بیاں تھا ، یا کوئی رنگِ بیاں آواز تھی

جال سا اک بُن رکھا تھا اُس نے میرے چار سو
رات ہو، دن ہو، جہاں میں تھا وہاں آواز تھی

دن کو سنتا اور رستہ بھول جاتا تھا ظفر
میری خاطر اِس طرح کی داستاں آواز تھی

☆☆☆

ظفر اقبال

یہ نہیں کہتا کہ دوبارہ وہی آواز دے
کوئی آسانی تو پیدا کر ، کوئی آواز دے

میں اُسے سُن کر بھی آنے کا نہیں، مجبور ہوں
پھر بھی، اپنے خواب خانے سے کبھی آواز دے

ہو سکے دونوں زمانوں میں ہم آہنگی کوئی
میں پرانا ہوں تو کیا ، مجھ کو نئی آواز دے

موت کے ساحل پر اِستادہ ہوں، تُو مجھ کو کہیں
زندگی کے پانیوں میں ڈوبتی آواز دے

ٹھیک ہے، تُو نے پکارا ہوگا جس تِس کو، مگر
میرے حصے میں کوئی آئی ہوئی آواز دے

بِن بُلایا ہی چلا آؤں گا میں شاید کبھی
لیکن اِتنے شور میں تُو آپ بھی آواز دے

میں اسے پہچان ہی پاؤں نہ پہلی بار تو
کوئی آوازوں کے جنگل میں گھری آواز دے

منہ سے کچھ کہہ تو سہی اِس خامشی کے آر پار
مستقل کو چھوڑ ، کوئی سرسری آواز دے

تو نے تو ہر حال میں سننا ہے، اب تجھ کو، ظفر
روشنی آواز دے یا تیرگی آواز دے

ظفر اقبال

کچھ پتا چلتا نہیں کس طرح کی آواز ہے
ان اندھیروں میں یہ تُو ہے یا تری آواز ہے

کچھ دنوں سے کر رہا تھا جس پہ سارا انحصار
آدمی سمجھا تھا میں لیکن کوئی آواز ہے

مجھ کو باہر سے بھی گھیرے میں لیے رکھتی ہے وہ
میرے اندر بھی وہی آہٹ ، وہی آواز ہے

راستہ تاریک راتوں میں سجھاتی ہے مجھے
کیا مسافت ہے کہ جس میں روشنی آواز ہے

ایک اُسی آواز کا یہ رنگ تھا کچھ اور بھی
ورنہ میں سمجھا تھا کوئی دوسری آواز ہے

یہ برابر میں جو بج اُٹھتی ہے باجے کی طرح
اصل میں اک دُور سے آتی ہوئی آواز ہے

میں گلے سے بھی لگا سکتا ہوں جب چاہوں اِسے
یہ نہ سمجھو صرف یہ آواز ہی آواز ہے

عکس بھی اِس میں جھلک جاتا ہے کوئی بار بار
جو کبھی ایک آئینہ ہے اور کبھی آواز ہے

ایک سناٹا سا ہے چھایا ہوا ہر سُو ، ظفر
اور اِس میں یہ ہماری آخری آواز ہے

ظفر اقبال

دیر تک آتی ہوئی یا مختصر آواز تھی
سر بسر پیکر تھا کوئی ، سر بسر آواز تھی

اس میں اب ملتی کہاں سے کچھ مجھے اپنی خبر
وہ تو اپنے آپ سے بھی بے خبر آواز تھی

لگ رہی تھی کوئی رونق سی مرے چاروں طرف
رات بھر تنہا تھا میں ، اور رات بھر آواز تھی

میں کہیں موجود ہی کب تھا اِس اپنے شہر میں
اور ، میری جستجو میں در بدر آواز تھی

فاصلہ دونوں میں اتنا تھا کہ طے ہوتا بھی کیا
آسماں پر آرزو ، اور خاک پر آواز تھی

کر گئی نقصان بھی دراصل بے پایاں مرا
وہ جو ظاہر میں تو اِتنی بے ضرر آواز تھی

میں تو اِک مُشت خس وخاشاک تھا، جیسا بھی تھا
اور ، میرے واسطے وہ اک شرر آواز تھی

کوئی منزل ہی نہ تھی دونوں کی دشتِ خواب میں
ورنہ کہنے کو تو میری ہم سفر آواز تھی

لمس کی گرمی کہاں سے آئی تھی اُس میں، ظفر
یہ اگر وہ خود نہیں تھا ، یہ اگر آواز تھی

☆☆☆

ظفر اقبال

اس اندھیرے میں اگر بندِ قبا درکار ہے
راہیٔ خوابِ ہوس کو اور کیا درکار ہے

کھانے پینے کا ابھی کیا ذکر ہے، فی الحال تو
سانس لینے کے لیے مجھ کو ہوا درکار ہے

مجھ کو دونوں ہی عجائب چاہئیں ، اے خوبرو
یہ الگ درکار ہے ، اور وہ جدا درکار ہے

میں ہی جم کر اک جگہ پر بیٹھنے والا نہیں
اس لیے بھی کوئی مجھ کو جا بجا درکار ہے

میں بھکاری ہوں ، مجھے خیرات کی ہے جستجو
وہ سخی ہے ، کوئی اُس کو بھی گدا درکار ہے

چاہتا ہوں میں بھی معشوق اپنی ڈھب کا ہو کوئی
آدمی اُس کو بھی کوئی کام کا درکار ہے

اپنی خاطر اس زمین و آسماں کے درمیاں
اور ہی اک طرح کی مجھ کو فضا درکار ہے

اِس خدائی کی رنگا رنگی میں کیوں مجھ کو یہاں
ایک سیدھا اور سادہ سا خدا درکار ہے

بے زباں ہوں، اور، مجھ کو بات کرنی ہے، ظفر
چل نہیں سکتا ہوں ، لیکن ، راستہ درکار ہے

ظفر اقبال

اور بھی اُس کی طرف سے پیش و پس درکار ہے
کس لیے ہے، چھوڑیئے یہ بات، بس درکار ہے

کس بہانے سے میسر ہو ، پتا چلتا نہیں
خواب گاہِ ناز تک جو دسترس درکار ہے

گھیر کر لاؤ اگر اُس کو تو مانیں گے تمہیں
یعنی وہ ہوتا نہیں جوٹس سے مس ، درکار ہے

اپنے لالچ میں اضافہ ہو رہا ہے روز و شب
ایک جو درکار تھا پہلے ، وہ دس درکار ہے

پھڑ پھڑاؤں جس سے میں آزاد ہونے کے لیے
جانے کیوں مجھ کو کوئی ایسا قفس درکار ہے

آنے والی اک ہوا کو پیش کرنے کے لیے
مجھ کو یکسو اپنا سارا خار و خس درکار ہے

آنے ہی والی ہے مجھ میں رنگِ زر کی آب و تاب
اور ، مجھے اُس کیمیا کا ایک مس درکار ہے

میرے چاروں سمت ہر شے کی فراوانی ہے، اور
جو مجھے درکار ہے ، وہ بھی عبث درکار ہے

اک ہوا مطلوب ہے باغِ محبت کو ، ظفر
اور ، پھولوں کو مہک ، پتوں کو رَس درکار ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

کچھ یہاں درکار ہے اور کچھ وہاں درکار ہے
اس زمیں کے ساتھ مجھ کو آسماں درکار ہے

اِس دفعہ رنگِ تماشا اور ہے جس کے لیے
اور ہی کوئی مجھے تاب و تواں درکار ہے

کچھ تو چیزوں کی میں قیمت بھی ادا کرنے کو ہوں
اور ، کچھ سامان مجھ کو رائگاں درکار ہے

برق ہے کوئی کہ اب جس کی سہولت کے لیے
شاخِ دُنیا پر مجھے ایک آشیاں درکار ہے

دیر سے خالی پڑا ہے ، اور غیر آباد سا
آبسے جس کو کرائے پر مکاں درکار ہے

جب مرے آثار ہی کا کچھ نہیں باقی سراغ
اب کہیں اُس کو مرا نام و نشاں درکار ہے

ماجرا ہے ایک ایسا بھی کہ مجھ کو آج کل
داستاں در داستاں در داستاں درکار ہے

عاقبت اکثر نے تو کر لی یہاں خود ہی خراب
اور اب کس کو مرا طرزِ بیاں درکار ہے

ذائقہ چکھنے سے پہلے یہ نہیں سوچا ، ظفر
ہے اگر درکار تو مجھ کو زباں درکار ہے

ظفر اقبال

خاک اُڑانے کے لیے، رہنے کو گھر درکار ہے
اک بیاباں جو مجھے بارِ دگر درکار ہے

لمحہ بھر کے واسطے کافی جسے سمجھا تھا میں
اب ہوا ظاہر کہ مجھ کو رات بھر درکار ہے

حال پر میرے تمہاری مہربانی اِن دنوں
آپ ہی اندازہ کر لو جس قدر درکار ہے

ہے ضرورت بھی بہت، اور منہ سے بھی کہتا نہیں
کوئی شے حالانکہ مجھ کو سر بسر درکار ہے

راستہ صحرا سے ہو باہر نکلنے کا کوئی
زندگی کی دھوپ میں مجھ کو شجر درکار ہے

ایک آسانی مجھے بھی ، اور سب کو بھی یہاں
جا بجا مطلوب ہے اور ، دربدر درکار ہے

کچھ ارادہ تو نہیں میرا سفر کا اب کی بار
احتیاطاً کچھ مجھے رختِ سفر درکار ہے

بات کرنے کی اجازت سے ہوں بے پروا، مگر
بات یہ ہے ، بات میں مجھ کو اثر درکار ہے

آج کل اخبارِ دل میں کام کرتا ہوں ، ظفر
آج بھی مجھ کو کوئی تازہ خبر درکار ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

آگ کا رشتہ نکل آئے کوئی پانی کے ساتھ
زندہ رہ سکتا ہوں ایسی ہی خوش امکانی کے ساتھ

تم ہی بتلاؤ کہ اُس کی قدر کیا ہوگی تمہیں
جو محبت مفت میں مل جائے آسانی کے ساتھ

بات ہے کچھ زندہ رہ جانا بھی اپنا آج تک
لہر تھی آسودگی کی بھی پریشانی کے ساتھ

چل رہا ہے کام سارا خوب مل جُل کر یہاں
کُفر بھی چمٹا ہوا ہے جذبِ ایمانی کے ساتھ

فرق پڑتا ہے کوئی لوگوں میں رہنے سے ضرور
شہر کے آداب تھے اپنی بیابانی کے ساتھ

یہ وہ دُنیا ہے کہ جس کا کچھ ٹھکانہ ہی نہیں
ہم گزارہ کر رہے ہیں دشمنِ جانی کے ساتھ

رائگانی سے ذرا آگے نکل آئے ہیں ہم
اس دفعہ تو کچھ گرانی بھی ہے ارزانی کے ساتھ

اپنی مرضی سے بھی ہم نے کام کر ڈالے ہیں کچھ
لفظ کو لڑوا دیا ہے بیشتر معنی کے ساتھ

ظفر اقبال

سنگ بھی موجود ہوں گے آئنہ خانوں کے ساتھ
کچھ حقیقت بھی ہوا کرتی ہے افسانوں کے ساتھ

تم اگر ایسے نہیں ، ملتے ملاتے تو رہو
آپ ہی انسان بن جاؤ گے انسانوں کے ساتھ

رُک گئے تھے ہم تمہارے دل میں تھوڑی دیر کو
کیا سلوک ایسا کیا کرتے ہیں مہمانوں کے ساتھ

اس تماشے میں ہماری نوعیت کچھ اور تھی
ناپتے تھے تم ہمیں کچھ اور پیمانوں کے ساتھ

صاحبِ خانہ سے تو کچھ کہہ نہ سکتے تھے ، مگر
اپنا جھگڑا ہی رہا دن رات دربانوں کے ساتھ

خاک اُڑاتے ہم اُدھر کو بھی نکل جاتے کبھی
کچھ اگر باغات بھی ہوتے بیابانوں کے ساتھ

اپنے ذمّے تھی شکست و ریخت جو بھی ، کر چکے
اور، چپکے سے گزر آئے ہیں طوفانوں کے ساتھ

کھول کر آنکھیں گزرتا ہوں جو اِن آثار سے
کوئی آبادی بھی ہو سکتی ہے ویرانوں کے ساتھ

سر بسر اپنوں کو جیسے دیکھ بیٹھے ہو ، ظفر
کچھ دنوں سے خوش بہت پھرتے ہو بیگانوں کے ساتھ

☆☆☆

ظفر اقبال

رفتہ رفتہ لگ چکے تھے ہم بھی دیواروں کے ساتھ
حشر اپنا بھی یہی تھا، ہم بھی تھے ساروں کے ساتھ

ایک ہلچل سی مچی رہتی ہے دل میں ہر گھڑی
ساتھ ہیں پیارے ہمارے، ہم نہیں پیاروں کے ساتھ

لگ گئی تھی موت کی اپنی بھی چھوٹی سی خبر
آخر اپنا بھی تعلق تھا اِن اخباروں کے ساتھ

آ رہی ہے ان کی خُو بُو اپنے اندر بھی کہیں
ہیں رعایا ہی، مگر رہتے ہیں سرداروں کے ساتھ

فرض کچھ پگڑی بچانا بھی ہے ، لیکن ایک دن
دیکھنا، سر بھی چلے آئیں گے دستاروں کے ساتھ

دُور سے تو فرق ہی کوئی نظر آتا نہیں
اس طرح رل مِل گئے ہیں پھول انگاروں کے ساتھ

ہو گئی ہے شکل ہی تبدیل درباروں کی اب
ورنہ ہم بھی کم نہیں وابستہ درباروں کے ساتھ

پڑ گئے تھے رائگاں پہچان کے چکر میں ہم
اپنی مرضی سے جو ہم اُڑتے نہیں ڈاروں کے ساتھ

بے تعلق بھی ہے وہ، ہم نے بھی ہے اب تک، ظفر
رابطہ جوڑا ہوا ٹوٹے ہوئے تاروں کے ساتھ

ظفر اقبال

ہر طرح سے مطمئن ہیں اپنی یکتائی کے ساتھ
ساتھ ہے تنہائی اپنے، ہم ہیں تنہائی کے ساتھ

مار رکھیں گے بہت اوروں کو بھی، اب کیا بتائیں
ورنہ مر تو جائیں گے ہم اپنی ہی آئی کے ساتھ

وہ کچھ اپنے آپ اُتھلے پانیوں میں آ گیا
ورنہ چاہا تھا اُسے ہم نے تو گہرائی کے ساتھ

جیسے تیسے یہ ہمارا حوصلہ ہی تھا کہ ہم
جی رہے تھے جو محبت اور مہنگائی کے ساتھ

ناشناسا ہی سہی ، اور دُور بھی ، لیکن کبھی
آ ہی نکلے گا وہ ساری اپنی رعنائی کے ساتھ

لُطف لو تم بھی کبھی زنجیر کی جھنکار کا
چار دن تم بھی گزارو اپنے سودائی کے ساتھ

گاؤں میں تو، شکر ہے، واقف نہیں ہے کوئی بھی
شہر میں رہتے تھے، لیکن کتنی رسوائی کے ساتھ

صلح بھی کم بخت کر لیتے ہیں آخر بعد میں
ورنہ بھائی کو لڑا سکتے تو ہیں بھائی کے ساتھ

عشق میں اپنی، ظفر، شہرت ہے کچھ ایسی کہ ہم
بے وقوفی بھی کیا کرتے ہیں دانائی کے ساتھ

☆☆☆

ظفر اقبال

ہمیں تلاش کسی کی نہیں ، کوئی مل جائے
مگر ملے تو ملے آج ہی ، ابھی مل جائے

یہی بہت ہے ، اِسی پر گزارہ کر لیں گے
وہ چومنے کو نہیں ، دیکھنے کو ہی مل جائے

ہمیں ابھی اُسے تفصیل سے نہیں ملنا
کسی دن آئے یہاں ، اور سرسری مل جائے

اُسی سے کام چلا لیں گے جوڑ جاڑ کے ہم
اگر کہیں کوئی خواہش کٹی پھٹی مل جائے

اِس اشتراک سے تو ایک بھی نہیں رہتی
محبتوں میں اگر رنگِ دوستی مل جائے

اُسی کی قدر بھی ہوتی ہے کچھ ہمیں جو یہاں
زیادہ تر نہ ملے اور ، کبھی کبھی مل جائے

گزر رہی ہے اندھیروں میں بھی ہماری مگر
ہے کیا ہی بات جو تھوڑی سی روشنی مل جائے

بھرا ہے شہر مگر یہ بھی شرط ہے کہ تمہیں
مرے سمیت اگر کوئی آدمی مل جائے

اب اس کا شکر ادا کیجیے کہ شکوہ ، ظفر
جو راہ چلتے مصیبت کوئی نئی مل جائے

☆☆☆

ظفر اقبال

کم سے کم ملا ہو یا بیشتر میسر ہو
اُس کا شکر ادا کیجیے جس قدر میسر ہو

جو بھی چاہیے سب کو ، احتیاج ہو جس کی
جابجا مہیا ہو ، دربدر میسر ہو

کوئی دُور کی دنیا منتظر ہو ، ساتھ اس کے
رہگزر میسر ہو ، اور سفر میسر ہو

جس طرف نہ ہو کچھ بھی، جائیں گے اسی جانب
اُس طرف نہیں جاتے ہم جدھر میسر ہو

زندگی جو ہے اپنی جستجو تمہاری ہے
پھر ہمارا جینا کیا تم اگر میسر ہو

اک شجر میسر ہو دھوپ کے زمانے میں
اور چھوڑ جانے کو ایک گھر میسر ہو

اس گھنے اندھیرے میں روشنی تو ہو کوئی
جانے خانۂ خس کو کب شرر میسر ہو

کچھ کمی کسی صورت پھر بھی رہ گئی ہر بار
یہ کبھی نہیں ہوتا سر بسر میسر ہو

ظلم، اے ظفر، اس سے بڑھ کے اور کیا ہوگا
عیب ہو مجھے درکار ، اور ہنر میسر ہو

ظفر اقبال

روز سانس لینے کو گر ہوا میسر ہو
اِس کے بعد خلقت کو اور کیا میسر ہو

اور چاہیے ہم کو کیا جہانِ فانی میں
خلق سے رہے گپ شپ ، اور، خدا میسر ہو

در کہیں نکل آئے اس فصیل میں کوئی
اور ، آنے جانے کو راستہ میسر ہو

ہر طرح سے پوری ہوں سب ضرورتیں اپنی
اِس کے ساتھ یہ سب کچھ اک جگہ میسر ہو

زندگی بھی ہو آساں ، موت بھی نہ ہو مشکل
یہ الگ ملے ہم کو ، وہ جدا میسر ہو

حُسن بھی وہی کچھ تھا ، عشق بھی یہی کچھ ہے
اب تو اور ہی کوئی سلسلہ میسر ہو

سب فضائیں اس کی ہیں ، کچھ نہیں کہیں اپنا
ہم کو اپنے حصے کی بھی فضا میسر ہو

کچھ نیا نویلا بھی شور ہے ہمیں درکار
یہ بھی کیا کہ ہنگامہ ایک سا میسر ہو

چھوڑیئے ، ظفر صاحب یہ مرض نہیں ایسا
جس کی آپ کو اب کے پھر دوا میسر ہو

ظفر اقبال

اس طرح کی عیاشی پھر کہاں میسر ہو
اس زمیں کے اوپر جو آسماں میسر ہو

وہ سفر کٹے گا کب ، اور کس طرح ، جس میں
بند ہو ہوا چاہے ، بادباں میسر ہو

گوشہ ایک ایسا ہی چاہیے کہیں ہم کو
دوسروں سے ہٹ کر بھی تُو جہاں میسر ہو

پیش و پس نہ ہو کوئی اس کے ملنے جلنے میں
قبل ازیں ہو ارزانی ، بعدازاں میسر ہو

قبضہ ہی جما کر کیوں لوگ بیٹھ جاتے ہیں
چار دن کرائے پر جو مکاں میسر ہو

کچھ تو ہم خریدیں گے بیچ کر بھی اپنا آپ
کچھ ہمیں سروساماں رائگاں میسر ہو

بجلیاں بھی کچھ اُس کا خود خیال رکھتی ہیں
اس نواح میں جس کو آشیاں میسر ہو

سوچنے سمجھنے کی پھر کہاں ہے گنجائش
ہم سخن ہو جب پیدا ، ہم زباں میسر ہو

رنگ ہے، ظفر، اس کا سب اُڑا اُڑا سا بھی
رنگ کے علاوہ بھی تو بیاں میسر ہو

☆☆☆

ظفر اقبال

کسی کو خوش تو کسی کو خفا کیا ہوا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ کیا کیا ہوا ہے

فضول ڈال کے اُس کو اِک آزمائش میں
اِک امتحان کا خود سامنا کیا ہوا ہے

کسی کے ساتھ جو کھلتے نہیں کئی دن سے
تو بند اپنا بھی ہر راستہ کیا ہوا ہے

اُسے بھی خود پہ سمجھتے ہیں آج تک واجب
جو قرض ہم نے کسی کا ادا کیا ہوا ہے

ہے یوں تو چھوڑا ہوا اپنے حال پر خود کو
اُسے بھی ہم نے سپردِ خدا کیا ہوا ہے

عجب نہیں جو کسی روز جا ہی نکلیں ہم
قیام گاہ کا اُس کی پتا کیا ہوا ہے

ہوا سی کوئی چلائی ہوئی ہے چاروں طرف
اور ایک باغ ہے جس کو ہرا کیا ہوا ہے

سخن سرائی میں خود ذمہ دار ہیں اُس کے
بُرا کیا ہوا ہے یا بھلا کیا ہوا ہے

کبھی تھے زندہ جس آواز کے طفیل ظفر
تو کس لیے اُسے خود سے جدا کیا ہوا ہے

ظفر اقبال

وہ دائرہ سا کہ جس میں سفر کیا ہوا ہے
سمجھ رہے ہیں کہ اس دل میں گھر کیا ہوا ہے

نہیں اُسے بھی یہ پیچیدہ راستے معلوم
سفر میں ہم نے جسے راہ بر کیا ہوا ہے

کسی سے مشورہ کرنے میں بھی نہیں کوئی ہرج
کہ ہم نے کام تو یہ بیشتر کیا ہوا ہے

شروع سے ہی قناعت پسند ہیں کیا کچھ
وہ شاخ تھی جسے ہم نے شجر کیا ہوا ہے

وہ آستانہ بھی پڑتا ہے راہ میں اس کی
یہ آرزو کہ جسے دربدر کیا ہوا ہے

کہیں ہوا نہیں اپنا بھی کوئی اندازہ
کہیں محاکمۂ دشت و در کیا ہوا ہے

جو ہیں تو لفظ ہی قائم ہیں ، اور معانی کو
اِدھر کیا ہوا ہے یا اُدھر کیا ہوا ہے

قیام پر ہے یہ خس خانۂ سخن کچھ دیر
کہ اپنے شعر کو ہم نے شرر کیا ہوا ہے

میں ایک وہم سے بڑھ کر نہیں ، ظفر کچھ بھی
وہ جانتا ہے ، اُسے باخبر کیا ہوا ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

یہ اپنی خاک جسے کہکشاں کیا ہوا ہے
زمیں کو ہم نے یہاں آسماں کی ہوا ہے

ہماری عمر کا اس سے نہیں کوئی سروکار
جو ہم نے ایک ارادہ جواں کیا ہوا ہے

ہمارا راز کوئی راز بھی نہیں کب سے
تو کس لیے پھر اُسے رازداں کیا ہوا ہے

سراغ اُس کا ملے گا کبھی اسی کے سبب
جو ایک نقش تھا اُس کو نشاں کیا ہوا ہے

بلا سے اپنی ، ہمیں بھی اگر بہا لے جائے
رُکا ہوا تھا جو پانی رواں کیا ہوا ہے

ہوئے ہیں کچھ تو سبکسار بھی اِسی کے طفیل
اگرچہ طبع کو اپنی گراں کیا ہوا ہے

تو اس لیے کہ یہاں بجلیاں بھی دُور نہیں
یہ بادلوں میں اگر آشیاں کیا ہوا ہے

کچھ اپنے نفع و ضرر میں بھی امتیاز نہیں
کہ سر پہ دھوپ کا ہی سائباں کیا ہوا ہے

یہ ذائقہ بھی زباں کے لیے ضروری تھا
ظفر کسی کو اگر بدگماں کیا ہوا ہے

ظفر اقبال

نہیں ہے وصل ، مگر ہو بہو کیا ہوا ہے
کٹا پھٹا ہوا دل جو رفو کیا ہوا ہے

یہ اس کا شوقِ ملاقات ہی نہ ہو یکسر
جو قطع رابطۂ گفتگو کیا ہوا ہے

جو پاس ہیں وہی خواب و خبر سے ہیں غائب
جو دُور تر میں اُنہیں روبرو کیا ہوا ہے

ہمارا اشک ہی اگر رفع ہو سکے کہ وہ شوخ
حریف بھی نہیں ، اور دوبدو کیا ہوا ہے

خبر نہیں وہ کہیں ہے بھی یا نہیں موجود
تو کس خوشی میں اُسے آرزو کیا ہوا ہے

عجب نہیں جو یہ پھیلاؤ ہو مرے اندر
وہ سامنے تھا جسے چارسو کیا ہوا ہے

رواں ہے خواب الگ اُس کو ڈھونڈنے کے لیے
روانہ خود کو جدا کُو بہ کُو کیا ہوا ہے

ہماری اپنی فضائیں ہیں ، اپنے ہی موسم
یہ گردوباد جسے رنگ و بُو کیا ہوا ہے

کسی کو اس سے غرض ہی نہیں کوئی کہ ظفر
یہاں جو لفظ کو ہم نے لہو کیا ہوا ہے

☆☆☆

ظفر اقبال

سفر کا راہ میں ہی اختتام کیونکر ہو
جو چل پڑا ہے تو قصہ تمام کیونکر ہو

لباس میں بھی ہے قندیل کی طرح روشن
بدن میں اتنا اُجالا ہے ، شام کیونکر ہو

جہاں کی چیز ہو ، اچھی وہیں پہ لگتی ہے
یہ دل کا چاند ہے ، بالائے بام کیونکر ہو

رُکی ہوئی ہے محبت اُداس اُداس کہیں
کوئی سبیل نہیں ، شادکام کیونکر ہو

کسی سبب سے کوئی رابطہ نہیں باقی
کلام کیسے ، پیام و سلام کیونکر ہو

بجا ہیں اس لیے بھی فکر مندیاں اپنی
کہ بات بھی نہیں ہوتی تو کام کیونکر ہو

ہے دل میں شوقِ ملاقات بھی بہت ، لیکن
سوال صرف یہ ہے ، انتظام کیونکر ہو

ہمارے نقش میں اُس کی نمود ہو کیسے
ہمارے نام کے ساتھ اُس کا نام کیونکر ہو

ظفر ، کٹی رہی تادیر عام لوگوں سے
جو طرزِ خاص تھی اب طرزِ عام کیونکر ہو

☆☆☆

ظفر اقبال

خیال جب سے پریشاں ہے خواب کیونکر ہو
سوال ہی نہیں ممکن ، جواب کیونکر ہو

جہاں پہ آبِ رواں کی بھی سانس رُکتی ہے
تو ایسے قحطِ ہوا میں حباب کیونکر ہو

ہوئے ہیں گم اِسی حالات کے اندھیرے میں
سو ، رنگ روپ ہو کیا ، آب و تاب کیونکر ہو

جو کاروبار ہی ٹھپ ہو رہے محبت کا
تو روز روز حساب و کتاب کیونکر ہو

اگر وہ چاند چمکتا نہیں تو پھر آخر
ہمارے پانیوں میں اضطراب کیونکر ہو

بحال رابطہ ہونا تو ہے کبھی اُس سے
مگر سوال ہے اِتنا ، شتاب کیونکر ہو

جہاں سوالِ جزا و سزا ہی اُٹھ جائے
وہاں تمیزِ گناہ و ثواب کیونکر ہو

ہم اپنے آپ کو تبدیل اگر نہیں کرتے
تو پھر وقوع پذیر انقلاب کیونکر ہو

خراب حال ہیں ، لیکن وہ چاہتا ہے ظفر
کہ حالت اور بھی اپنی خراب کیونکر ہو

ظفر اقبال

کہیں وہ ہے تو سہی ، دوستی نہیں ، پھر کیا
ہماری اس سے ملاقت بھی نہیں ، پھر کیا

وہ آئے تو سہی ، کام آئے گا اندھیرا بھی
ہمارے گھر میں اگر روشنی نہیں ، پھر کیا

ہم اُس سے چاہتے ہیں جس طرح کا ہونے کو
وہ ہو بھی جائے گا ، لیکن ابھی نہیں پھر کیا

یہ گفتگوئیں ، یہ دن رات رابطے ، آخر
یہ خوابِ عشق سہی ، دل لگی نہیں ، پھر کیا

میں اُس سے پوچھوں گا ملنا ہے اُس نے کب مجھ سے
جو وہ جواب میں کہہ دے ، کبھی نہیں ، پھر کیا

وہ نیک بخت کسی کے تو کام آئے گی
چلو ، ہمارے اگر کام کی نہیں ، پھر کیا

وہ لہر جس کا مجھے انتظار تھا کب سے
جو میرے پاس پہنچ کر رُکی نہیں ، پھر کیا

کسے خبر ہے کہ ہم بھی وہاں پہ ہوں کہ نہ ہوں
جہاں ہمارے علاوہ کوئی نہیں ، پھر کیا

ہماری بات پہ بے اختیار ہو کے ، ظفر
ہنستی تو خوب تھی ، لیکن پھنسی نہیں ، پھر کیا

☆☆☆

ظفر اقبال

لہر کی طرح کنارے سے اُچھل جانا ہے
دیکھتے دیکھتے ہاتھوں سے نکل جانا ہے

دوپہر وہ ہے کہ ہوتی نظر آتی ہی نہیں
دن ہمارا تو بہت پہلے ہی ڈھل جانا ہے

جی ہمارا بھی یہاں اب نہیں لگتا اِتنا
آج اگر روک لیے جائیں تو کل جانا ہے

دل میں کھلتا ہوا ایک آخری خواہش کا یہ پھول
جاتے جاتے اسے خود میں نے مسل جانا ہے

جو یہاں خود ہی لگا رکھی ہے چاروں جانب
ایک دن ہم نے اِسی آگ میں جل جانا ہے

چلتی رُکتی ہوئی ، یہ حسن بھی ہے ایک ہوا
موسمِ عشق بھی اک روز بدل جانا ہے

جیسے گھٹّی میں کوئی خوف پڑا ہو اس کی
بات بے بات ہی اس دل نے دہل جانا ہے

اور تو ہونی ہے کیا اپنی وصولی اُس سے
مُنہ پہ کالک یہ ملاقات کی مل جانا ہے

میں بھی کچھ دیر سے بیٹھا ہوں نشانے پہ ، ظفر
اور ، وہ کھینچا ہوا تیر بھی چل جانا ہے

ظفر اقبال

کہیں ایسا نہ ہو اندازہ ہی اُلٹا نکل آئے
جسے ہم دل سمجھتے آئے ہیں ، دنیا نکل آئے

غُبارِ غیب سے باہر نکل تو آئے وہ ، کیا ہے
اگر ایسا نکل آئے ، اگر ویسا نکل آئے

زمانے کے لیے جتنا بُرا بھی ہو، مگر ، پھر بھی
یہ ممکن ہے کہ اپنے حق میں وہ اچھا نکل آئے

بظاہر مطمئن اور بے خبر پھرتے ہیں، ایسے میں
اچانک ایک دن سر میں کوئی سودا نکل آئے

کہیں دل سے گزشتہ خوف کی دھجی برآمد ہو
کہیں پاٹے پُرانے خواب کا پُرزہ نکل آئے

رُکے ہیں سلسلے سارے، اِسی اُلجھن میں رہتے ہیں
کوئی دروازہ کھل سکتا ، کوئی رستہ نکل آئے

کسی سے اتفاقاً ملاقات اس طرح تھی ، جیسے
سفر ہو، پیاس ہو، اور دشت میں دریا نکل آئے

بہت خوش بھی نہیں اس ناشناسا شہر میں آ کر
کہ ڈرتے ہیں جو اس میں بھی کوئی اپنا نکل آئے

ظفر، اُس بزم میں جانے سے کتراتے رہے پیہم
کہ ہم کیا سوچتے ہوں اور وہاں پر کیا نکل آئے

☆☆☆

ظفر اقبال

ہماری موت کا اب اور کیا منظر نکل آئے
ہم ایسی چیونٹیاں ہیں جن کے آخر پر نکل آئے

لگا رکھا ہو اُس کی شکل کا جیسا بھی اندازہ
تو کیا کیجے اگر وہ اس سے بھی بڑھ کر نکل آئے

اندھیرے میں تمہاری روشنی کا ایک ٹکڑا سا
وہی اندر سمٹتا ہے ، وہی باہر نکل آئے

یہاں بھی گھومتا رہتا ہے صبح و شام سر اپنا
وہاں پہنچیں تو کوئی اور ہی چکر نکل آئے

دوبارہ دیکھتے ہیں کوئی کوشش کر کے، ممکن ہے
نتیجہ اس دفعہ شاید ذرا بہتر نکل آئے

اگر ممکن ہے اتنا کچھ ترے شہر تماشا میں
تو ہو سکتا ہے اس دیوار میں بھی در نکل آئے

روانی اور پایابی میں فرق اتنا ہی تھا سارا
جہاں پانی ہوا غائب وہاں پتھر نکل آئے

مسلسل یاد میں رہتے تھے جو بھُولے اُنہی کو ہم
جنہیں ہم بھول بیٹھے تھے وہی از بر نکل آئے

ظفر، آساں نہیں گھر سے نکلنا بھی، مگر اب کے
کبھی نکلے نہیں تھے جو وُہی اکثر نکل آئے

ڈاکٹر عباس برمانی

شاہراہِ مسرت

وہ انتہائی فاتحانہ وقار کے ساتھ شہر نگاراں کی سڑکوں پہ کار چلا رہا تھا اور اپنے اطراف سے گزرنے والی قیمتی اور لگژری گاڑیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا، اگرچہ خود اس کے پاس بیس سال پرانے ماڈل کی کار تھی، لیکن وہ بے حد مطمئن تھا۔ اس نے پیار بھری نظروں سے گاڑی کے اندر نظر دوڑائی اور پھر مسکرا کر ڈیش بورڈ کو تھپکی دی ''تم ہی ہو صرف تم'' اس نے آہستگی سے کہا، ''آج ہم دونوں مل کر ایک بہت بڑا فریضہ انجام دیں گے، تم ہی ہو جو مجھے چشم زدن میں فضائے بسیط اور خلا کی وسعتوں میں سے گزار کر اَبدی مسرتوں سے ہم کنار کرو گی''، اس نے ایک موڑ لیا اور رنگ و نور میں ڈوبی ہوئی ایک عمارت کی طرف بڑھنے لگا۔ سامنے بے شمار چمکتی دمکتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ہنستے کھلکھلاتے خوش پوش مرد و زن تھے۔ موسیقی کی آوازیں گونج رہی تھیں۔۔۔ اور پھر ایک دم منظر بدل گیا۔

☆

رنگ برنگی روشنیاں، بڑے بڑے شیشے، منقشی ٹائلیں، سنگِ مرمر کے تختے سب غائب ہو گئے۔ عمارت کے چاروں طرف بے شمار سرخ سانپ اپنے خوفناک پھن اور ڈراؤنی دو شاخہ زبانیں لہراتے تھے، وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے، وہ عمارت کے ہر دروازے پر دریچے پر روشن دان میں سے اُبلے پڑ رہے تھے اور انہوں نے عمارت کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا، نیچے سطحِ زمین پر متعدد بھیڑیے، شیر اور چیتے اپنے خونیں دانت نکالے اور سبز رنگ کے بڑے بڑے مگر مچھ دہشت ناک جبڑے پھاڑے اس کی گاڑی کی طرف بڑھ رہے تھے، وہ غیظ و غضب میں بھر گیا، تیوریاں چڑھ گئیں، آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ ذہن کے گوشوں سے کف بہنے لگا ''آؤ آگے بڑھو'' تمہیں ختم کرنے تو میں آیا ہوں۔ آج میں تم سب کو بھسم کر دوں گا۔ پھر ایسا ہوا کہ اس کی گاڑی کی روشنیوں کی شدت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، یوں لگتا تھا جیسے وہ ہیڈ لائٹس نہ ہوں دو چھوٹے چھوٹے سورج ہوں، ان کی حدت سے وہ تمام بلائیں بھسم ہونے لگیں اور پگھل کر مائع میں بدلنے لگیں۔ سرخ، سبز، سیاہ، سفید مائع کی کئی ندیاں اس کی سمت آنے لگیں، حیرت کی بات تھی کہ وہ ایک دوسرے میں مدغم نہ ہوتی تھیں جدا جدا بہتی تھیں اور اس تیزی سے گویا اس کی گاڑی کو بہا کر لے جائیں گی لیکن جیسے ہی وہ اس کے قریب پہنچیں خشک ہو کر غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ ایک بے انت سبزہ زار نے لے لی۔

☆

اس سبزہ زار میں کئی نیلگوں شفاف ندیاں بہتی تھیں، ندیوں کے اطراف دور و یہ سایہ دار

درخت تھے، باغ تھے جن میں انجیر، زیتون، انار اور سیپ کے پھلوں سے لدے ہوئے درخت تھے۔ چھتنار درختوں پہ انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں جن پہ سرخ، سبز، عنابی اور سیاہ انگوروں کے رس بھرے گچھے لگے تھے۔ درختوں کی ٹہنیوں میں مرغانِ خوش نوا نغمہ سرا تھے۔ پھر اسے درختوں میں گھر ہوا کی ایک عظیم الشان دودھیا سفید محل دکھائی دیا، ایک روشن شاہراہ اس محل کی سمت جا رہی تھی، وہ اس طرف بڑھا، محل کے پھاٹک پر پھولوں کے ہار اور گلدستے لیے زرق برق لباسوں میں ملبوس درجنوں حسین و جمیل لڑکیاں قطاروں میں کھڑی تھیں، جیسے ہی اس نے گاڑی روکی وہ لڑکیاں ہار اور پھول لیے مسکراتی ہوئی اس کی طرف آنے لگیں مگر جب وہ گاڑی سے اُترنے لگا تو وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور تیز تیز قدموں سے چلتی محل کے اندر داخل ہو گئیں اور پھاٹک بند ہو گیا ''اُفوہ یہ دروازہ کیوں بند ہو گیا اور یہ کھلے گا کیسے'' اس نے خود کلامی کی اندر سے ایک مترنم آواز آئی ''اسے گاڑی ٹکرا کر توڑ دو اندر ہم تمہاری منتظر ہیں''۔ گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے گیا پھر گیئر بدل کر اسے پوری رفتار سے پھاٹک کے ساتھ ٹکرا دیا، ایک خوفناک دھماکا ہوا اور گاڑی راکٹ کی طرح فضا میں اُٹھی۔۔۔ایک ثانیے، ایک لمحے کے کچھ حصے کے لیے اس کی نظر ٹوٹی ہوئی ونڈ سکرین سے باہر گئی، جہاں شعلوں کی زبانیں انسانوں کو چاٹ رہی تھیں اور وہیں اسے شعلوں میں گھرا اٹھارہ سال کا ایک نوجوان موت کے رقص میں مشغول نظر آیا۔۔۔اور پھر اس نے دیکھا کہ حسیناؤں کے دودھ سفید وجود سٹیل فاؤنڈری میں پگھلتے ہوئے قرمزی مائع لوہے میں بدل کر بہتے جا رہے تھے، چناروں کے جلتے ہوئے پتے آتشیں بگولوں میں اڑ رہے تھے۔ ننگی بچی ٹہنیوں پر جلتے ہوئے پرندے بین کر رہے تھے، رس بھرے انگور آتش بازی کا منظر پیش کرتے ہوئے فضا میں شرارے بکھیر رہے تھے، انار، سیب انجیر اور زیتون بموں کی مانند پھٹ رہے تھے اور ٹنڈ منڈ درختوں کو جلا کر راکھ کر رہے تھے۔ محل کے جلنے کے ساتھ ریزہ ریزہ ہو کر فضائے بسیط میں بکھرنے سے پہلے جبار نے ایک مذبوحانہ چیخ مار کر کہا میرا بیٹا، میرا بچہ۔۔۔۔

☆☆☆

عابد میر

عطیہ

مُلک کے ایک حصے میں زلزلہ کیا آیا سارا ملک ہی ہل کر رہ گیا۔ زلزلہ کیا تھا، پوری قیامت تھی جو ایک پل میں گزر گئی تھی۔ بستیاں اُجڑ گئیں، شہر مٹ گئے۔ ہزاروں لاشیں نکلیں، سینکڑوں ملبے تلے دبے رہ گئے تو لاکھوں بے گھر ہو گئے۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ ٹی وی، ریڈیو، اخبار، دفاتر، ہوٹل، بازار غرض جہاں جائیے ایک ہی موضوعِ سخن تھا۔

''بس بھائی اللہ کا قہر تھا جو ہم پر نازل ہوا'' ایک دوست نے استغفار پڑھتے ہوئے کہا ''کہتے ہیں جب کسی دھرتی پر ظلم، ناانصافی اور برائیاں حد سے بڑھ جائیں تو وہیں خدا ایسے عذاب نازل کرتا ہے۔'' دوسرے دوست نے گویا دلیل دے کر بات کو مزید واضح کیا۔

''ہاں بھائی، خدا اپنی ناراضگی کا اظہار ایسے ہی کرتا ہے۔ حضرت نوح اور لوط کی قوموں کے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا'' تیسرے نے بھی تائید کر دی۔

اُس سے رہا نہ گیا اور آخر کار وہ اپنی میز چھوڑ کر اُٹھ آیا اور جونیئر کلرکوں کے اس غیر رسمی اجلاس میں آ بیٹھا۔ آتے ہی اُس نے نہایت ترش قسم کا سوال پوچھ ڈالا ''دوستو اگر آپ کے بقول زلزلہ اور تمام قدرتی آفات خدا لاتا ہے تو پھر معذرت کے ساتھ یہ خدا نہیں ایک جلاد ہے جو فقط اپنی ناراضگی اور غصے کے اظہار کے لیے معصوم بچوں اور عمر رسیدہ بزرگوں سمیت ہزاروں بے گناہوں کی جانیں لے لیتا ہے اور ہر خوبصورت چیز کو ملیا میٹ کر دیتا ہے کیا یہ صحیح ہے؟''

''لاحول ولا۔۔۔میاں کیا کفر بکتے ہو۔۔۔ توبہ، توبہ کرو۔۔۔ استغفراللہ۔۔۔ استغفراللہ۔۔۔۔'' مشت بھر داڑھی والا اس کا دوست کانوں کو یوں ہاتھ لگا رہا تھا گویا یہ کفر اُس سے سرزد ہوا ہو۔

''ابھی آپ لوگ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ یہ سب خدا کا کیا ہے۔'' اُس نے نہایت سادگی سے کہا۔ ''بھائی اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے جسے صرف وہی جانتا ہے۔ یہ ہمارے تمہارے جیسے عام انسانوں کے بس کی بات نہیں۔'' دوسرے دوست نے بھی گویا اُسے دلیل دے کر خاموش کرانا چاہا۔

''لیکن دوستو۔۔۔'' وہ پھر بول پڑا مگر اس کا جملہ اُس کے منہ میں ہی تھا کہ اُس کی بات کاٹ دی گئی۔

بھئی میاں فلاسفر، اپنا فلسفہ اپنے پاس رہنے دو۔ خود تو کافر ہو گیا ہمیں بھی کافر بناؤ گے؟''

تیسرے دوست نے اپنے ایمان کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے کہا اور تینوں ایمان کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہوئے پھر اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ اُس نے جب دیکھا کہ وہ نظر انداز ہو رہا ہے تو خاموشی سے اُٹھ کر اپنی کرسی پر آ بیٹھا اور یونہی بے سبب ٹائپ رائیٹر پر اُنگلیاں چلانے لگا۔۔۔ٹپ ٹپ ۔۔۔ٹپ ٹپ ٹپ۔۔۔ٹپ ٹپ۔۔۔

اگلے روز دفتر میں پھر وہی مباحثہ جاری تھا۔ پہلے تو اُس نے کوشش کی کہ اس گفتگو میں شامل نہ ہو لیکن آج جب دوستوں نے خود اُسے بلایا تو وہ انکار نہ کر سکا اور اُن کے درمیان چلا آیا۔

''بات یہ ہے دوستو۔۔۔'' اُسی مشت بھر داڑھی والے دوست نے بات شروع کی۔ ''جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ اس وقت ملک پہ ایک قیامت ٹوٹ چکی ہے۔ ہمارے بھائی جو اس آفت کا شکار ہوئے، اس وقت سخت مصیبت میں ہیں اور کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود امدادی ٹیمیں ابھی تک ملبے سے لاشیں نہیں نکال سکیں۔ بے گھر ہونے والے سینکڑوں لوگ اب تک کھلے آسمان تلے بھوک، پیاس کی شدت سے مر رہے ہیں۔''

''جی ہاں دُنیا کا ساتوں بڑا ایٹمی ملک ایک قدرتی آفت کو منہ نہیں دے سکتا خدانخواستہ یہاں جنگ چھڑ جائے تو کیا حالت ہوگی؟'' دوسرا بولا۔

''ارے بھائی بے ضمیر حکمران جہاں مسلط ہوں گے وہاں تو یہی ہوگا نا۔۔۔لوگ بھوک پیاس سے مر رہے ہیں اور یہ لوگ ایوانوں میں بیٹھ کر، شکم سیر ہو کر ٹی وی پر آ کر دُنیا سے امداد طلب کر رہے ہیں۔ ہونہہ۔۔۔ڈوب مرنا چاہیے انہیں۔۔۔'' تیسرے نے بھی اپنی بھڑاس نکالی۔

''تو پھر حکمران دُنیا سے ضمیر کی امداد کیوں نہیں لے لیتے۔'' اُس نے سادگی سے پوچھ ڈالا۔

''ملتا تو شاید وہ بھی لے لیتے لیکن ___ اب تو عالمی ضمیر بھی مر چکا ہے بھائی۔'' اُسی دوست نے ناگوار تاثر کے ساتھ جواب دیا۔

''خیر بھائیو! حکمران جانیں اور اُن کا کام ___ میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بلایا تھا کہ جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ اس وقت مصیبت زدہ لوگوں کے لیے ملک بھر میں ریلیف فنڈ اکٹھا کیا جا رہا ہے میں نے سوچا کیوں نہ ہم کلرک دوست مل کر اپنی ایک دِن کی تنخواہ ریلیف فنڈ میں جمع کروائیں؟!'' باریش موصوف نے مقصد بیان کرنے کے بعد رُک کر گویا سب کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

''کیوں نہیں، یہ تو ثواب کا کام ہے۔ بالکل ہونا چاہیے۔'' باقی دوستوں نے فوراً رضامندی ظاہر کی۔ ''لیکن دوستو۔۔۔'' وہ پھر بول پڑا ''ایک پرائیوٹ فرم میں کام کرنے والے مزدوروں کی ایک دن کی تنخواہ ہوتی ہی کتنی ہے، کیوں نہ ہم ایک ہفتے کی تنخواہ دے دیں۔ اُس نے تجویز دی۔

''دیکھو میاں جس کی جتنی استطاعت ہے وہ اتنا ہی دے، اوپر سے عید سر پر ہے۔ بچوں کی خریداری اور دیگر مسائل کو بھی منہ دینا ہے۔'' اسی باریش دوست نے توجیہہ پیش کی جس کی تمام دوستوں

نے حمایت کی۔ مجبوراً اُسے بھی اس فیصلے کی حمایت کرنی پڑی۔

لیکن وہ سارا دن سوچتا رہا کہ پانچ ہزار کی کل ماہوار تنخواہ میں ایک دن کی آمدن بمشکل ڈیڑھ سو روپے بنتی ہے۔ اس سے بھلا کیا ہوگا؟ کچھ اور کرنا چاہیے۔ عطیہ دینا ہی ہے تو ایسی چیز کا دیا جائے جس کی سخت قلت ہو اور جو کسی مستحق کے کام آ سکے لیکن ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے جو اُس کے پاس موجود بھی ہو یا جس کا وہ انتظام کر سکے۔ وہ سارا دن اور پھر رات دیر گئے تک یہی بات سوچتا رہا۔ رات کے کسی پل سوچتے، سوچتے اُسے اپنی ہی کہی ہوئی ایک بات یاد آ گئی۔ دماغ میں ایک جھماکہ سا ہوا اور اُسے گویا راستہ مل گیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ وہ کیا چیز عطیہ دے گا۔ یہ طے کر کے وہ اطمینان سے سو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے تیار ہو کر آفس سے پہلے وہ بینک چلا گیا۔ جہاں ریلیف فنڈ کے لیے رقوم اور اشیاء جمع ہو رہی تھیں۔ ہجوم دیکھ کر پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے بات کرے گا اور اپنی بات کیسے سمجھا پائے گا۔ کاؤنٹر تک آتے آتے اُس کا گلہ سوکھ چکا تھا۔ آخر کار اُس نے ہمت کی۔

''مجھے منیجر صاحب سے ملنا ہے۔''

''جی کس سلسلے میں۔''

''میں ریلیف فنڈ میں کچھ جمع کرانا چاہتا ہوں۔''

''تو یہاں جمع کرا دیجئے، آپ کو ابھی رسید مل جائے گی۔''

''جی نہیں اصل میں۔۔۔رقم نہیں۔۔۔مجھے کچھ اور عطیہ دینا ہے۔''

کچھ اور۔۔۔'' کیشیئر نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دہرایا اور پوچھا ''کوئی قیمتی چیز ہے؟''

''جی ہاں بہت ہی قیمتی ___ میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔''

''اوہ، اچھا۔۔۔آپ تشریف رکھیے، میں ابھی منیجر صاحب کو بتاتا ہوں۔'' کیشیئر نے اُسے نہایت غور سے دیکھتے ہوئے خوش ہو کر کہا۔ فون ملاتے ہوئے کیشیئر سوچ رہا تھا شکل وصورت اور وضع قطع سے تو اچھا شریف آدمی لگتا ہے۔۔۔ایسی کیا چیز ہوگی جو یہ صرف منیجر صاحب کو ہی دے گا۔۔۔لگتا ہے سونا وغیرہ لایا ہے۔۔۔

''جی جائیے، وہ دائیں طرف پہلا کمرہ منیجر صاحب کا ہے۔'' کیشیئر نے فون رکھتے ہوئے اُسے راستہ بھی بتا دیا۔

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟''

''جی، جی آیئے، تشریف رکھیں'' منیجر اُس کے لیے کھڑا ہوا تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔

''آپ کوئی قیمتی چیز ریلیف فنڈ میں دینا چاہتے ہیں۔'' منیجر نے گویا تصدیق کرنا چاہی۔

''جی بہت ہی اہم چیز ہے۔''

''ایک منٹ، میں ذرا رسید بک نکال لوں۔'' منیجر نے دراز کھولتے ہوئے کہا۔

''نہیں، نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''کوئی بات نہیں یہ تو ایک فارملٹی ہے۔'' اُس کے انکار کے باوجود منیجر نے مسکراتے ہوئے رسید بک نکال کر سامنے رکھی۔ سامنے لگا ہوا فاؤنٹین پین نکالا اور نہایت متانت سے پوچھا

''آپ کا اسمِ گرامی۔''

''پتہ نہیں''

''کیا، پتہ نہیں ___ ؟!'' منیجر جیسے اُچھل پڑا۔

''میرا مطلب ہے، یاد نہیں۔'' وہ سخت بوکھلاہٹ کا شکار ہو رہا تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کو اپنا نام یاد نہیں۔'' منیجر کے چہرے پر اب حیرت اور پریشانی کے ہلکے ہلکے آثار چھا رہے تھے۔

''جی، یاد تھا وہ بس ابھی بھول گیا، کوشش کرتا ہوں یاد کرنے کی۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ اُسے لگا کہ جیسے اُس کا دم گھٹ رہا ہے۔

''اوہ، کوئی بات نہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں، آپ یہاں بالکل بحفاظت ہیں۔''

منیجر ایک دم نرم پڑ گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی بڑی قیمتی چیز عطیہ دیتے ہوئے کیا حالت ہو سکتی ہے۔ اُس نے خود اُٹھ کر کھڑکی کے پردے ہٹا دیے واپس آ کر پانی کا گلاس اُس کے سامنے رکھا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔ منیجر دوبارہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

''ویسے آپ کرتے کیا ہیں؟'' منیجر نے گویا اُس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''جی میں ایک پرائیویٹ فرم میں جونیئر کلرک ہوں۔''

''کلرک ___ ؟!'' منیجر کو جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔ چند لمحے خاموشی سے گزر گئے۔ ''اچھا بتائیے آپ کیا چیز عطیہ دینا چاہتے ہیں؟'' منیجر نے اس قدر ناگواری سے پوچھا گویا وہ مزید وقت ضائع نہ کرنا چاہتا ہو۔

''اپنا ضمیر!'' اُس نے تمام تر قوت مجتمع کر کے ایک دم کہہ ڈالا۔

''وہاٹ ۔۔۔'' منیجر چلا اُٹھا، ''تم ہوش میں تو ہو مسٹر ۔۔۔؟''

''جی بالکل ۔۔۔ میں اپنے ہوش و حواس کے ساتھ اپنا ضمیر عطیہ کر رہا ہوں۔ دیکھئے منیجر صاحب آپ پلیز میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔'' وہ کپکپاتے ہونٹ اور لرزتے بدن کے ساتھ بول رہا تھا۔ ''میرے دوست کہہ رہے تھے کہ ضمیر نہ ہونے کی وجہ سے حکمران ابھی تک لوگوں کی مدد نہیں کر سکے۔ اس لیے میں ان کے لیے اپنا ضمیر عطیہ دینا چاہتا ہوں ۔۔۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ نہ تو بکا ہوا ہے اور نہ مردہ ہے۔ یہ بالکل اپنی اصل حالت میں ہے۔ آپ پلیز اسے ریلیف فنڈ میں جمع کر کے لوگوں کو بچا لیجئے۔ میرے اور دوست بھی ہیں جن کے پاس زندہ ضمیر ہیں، میں وہ بھی آپ کو بطور عطیہ

دلواؤں گا۔ آپ پلیز اسے لے لیجئے ۔۔۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا منیجر صاحب ۔۔۔؟''

منیجر کے چہرے کا رنگ سرخ ہو چکا تھا۔ کان کی لویں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔

چوکیدار جیسے ہی اندر آیا، وہ برس پڑا۔

''لے جاؤ اس جاہل کو اور دھکے مار کے باہر نکال دو، پاگل خانے بھجوا دو اسے، ٹانگیں توڑ دو اس کی، لے جاؤ اسے یہاں سے، میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا ۔۔۔'' وہ چلّا رہا تھا۔

چوکیدار اُسے پکڑ کر باہر لے جانے لگا۔ تب تک منیجر کے چلانے کے باعث بینک کا سارا عملہ وہاں جمع ہو چکا تھا۔ سب اُسے گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے اور وہ مسلسل چلّا رہا تھا۔

''منیجر صاحب خدا کے لیے میری بات سنیں، میں پاگل نہیں ہوں۔ میری بات مانیں، پلیز میرا ضمیر لے لیں، یہ زندہ اور اصل حالت میں ہے، بے شک اسے چیک کروا لیں، لیکن پلیز اسے لے لیں، حکمرانوں کو اس کی شدید ضرورت ہے، یہ لے لیں اور انسانوں کو بچا لیں ۔۔۔ پلیز ۔۔۔ میری بات سنیں۔''

چند ہی لمحوں بعد وہ اپنے ''زندہ ضمیر'' سمیت بینک کے دروازے کے باہر پڑا تھا۔ دروازے کے ساتھ عطیات جمع کرانے والوں کی قطار اور لمبی ہو چکی تھی ___ !!

☆☆☆

زاہد یعقوب

''تمنا بے تاب'' از ڈاکٹر رشید امجد (ایک جائزہ)

ڈاکٹر رشید امجد اردو ادب میں اردو افسانے کے حوالے سے ایک جانی پہچانی شخصیت کے حامل ہیں۔اس سے قطع نظر ان کی زیر بحث کتاب ''تمنا بے تاب'' جو آپ بیتی کے طور پر اردو ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ دراصل آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی کے حوالے سے دیکھی جانی چاہیے۔اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ ''تمنا بے تاب'' ان کی زندگی کے نجی گوشے آشکار نہیں کرتی اور ان کی ذات ہمارے سامنے مشکل نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ زیر بحث کتاب میں خارج داخل پر غالب ہے جس کی بناء پر مصنف کی شخصیت اپنے پورے داخل کے ساتھ ہمارے سامنے نہیں آتی۔

مصنف بچپن سے اپنے ساتھ چلے آرہے اندرونی خوف کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ مصنف کا حد سے زیادہ شرمیلا پن اور جھجک ہے۔جس کا ذکر مصنف نے خصوصی طور پر کیا ہے۔جسکی وجہ مصنف کی والدہ کی بہت زیادہ ڈانٹ ڈپٹ اور روک ٹوک سے پیدا ہونے والا نفسیاتی خوف ہے۔ یہ عوامل مل کر مصنف کو اندرونی طور پر بہت زیادہ تنہا و بیگانہ کرتے چلے گئے ہیں اسی لیے مصنف اپنی سوانح عمری میں بہت زیادہ خارجیت پسند یا بروں بیں نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مصنف کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہوسکتی ہے اور خامی بھی یہی۔خوبی اس لحاظ سے کہ اسی نفسیاتی خوف اور بہت زیادہ شرم اور جھجک کی وجہ سے پیدا ہونے والی دروں بینی کے باعث لاوے کی طرح اندر ہی اندر پکنے والی تمام حسرتیں اور خواہشیں اپنے اظہار کے وسیلے کے محتاج تھیں۔لیکن پھر بھی جب کبھی اور جہاں کہیں مصنف کو کچھ کہنے اور کرنے کا موقع ملا وہاں بھی وہ کھل کر بیان نہیں کر پایا۔یہی وجہ ہے کہ اپنے ذاتی تجربات ومشاہدات کی صورت میں مصنف کی کہانی دھیرے دھیرے اور مسلسل گہرائی میں اترتی محسوس ہوتی ہے جب کہ خامی اس حوالے سے ہے کہ اگر مصنف اپنے نفسیاتی خوف اور جھجک پر قابو پالیتا تو دروں بینی اور بروں بینی کے سنگم پر بننے والی انتہائی خوب صورت قوس قزح کی تشکیل نئی جہتوں کو چھو جاتی۔جس طرح میرؔ کے اندر ہی اندر فنا ہونے والی تمام حسرتیں ایک ردعمل کا موجب بھی بن رہی تھیں۔لیکن میرؔ کا کمال بھی تو یہی ہے کہ میرؔ نے اپنے تمام غموں، دکھوں، خواہشوں اور حسرتوں کو سمیٹ کر نکھار کر اور جلا دے کر وسیلہ اظہار کی خوب صورت ترین اور نئی شکل میں پیش کر دیا۔لیکن رشید امجد کی بہت زیادہ جھجک، شرمیلا پن اور نفسیاتی خوف اسے کچھ کہنے اور کرنے سے ہمیشہ روکتا رہا۔اغلب ہے کہ مصنف اظہار کے معاملے میں اور خصوصی طور پر اپنے اظہار کے معاملے میں محتاط نظر آتا ہے۔اس کی سوانح عمری کے نام ''تمنا بے تاب'' سے یہ بات صاف عیاں ہے جیسا کہ اس نے خود بیان کیا ہے کہ

''ہم خواب دیکھنے والے تھے جن کی بے تاب تمنائیں مچل مچل رہی تھیں''۔

کہانی لکھنے اور کہنے کے فن کی مہارت کے باعث ''تمنا بے تاب'' دھیرے دھیرے آگے بڑھتی ہے اور قاری کو دلچسپی کے تمام سامان عطا کرتی جاتی ے۔دوسری بات یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنی تحریر میں مکمل طور پر نہ سہی کسی حد تک اپنی ذات اور نجی زندگی کو بہر حال شامل حال کیا ہے۔اور اس پر طرح یہ ہے کہ اس نے اپنے اردگرد کے ماحول ومعاشرت، سیاسی وسماجی اور ثقافتی واخلاقی تمام حوالوں کو اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے جیسے ایک چھت کو قائم رکھنے والی تمام کڑیاں کسی مظبوط شہتیر میں غائب اور ضم ہوتی چلی جاتی ہیں اور کہانی کے اہم عناصر تشکیل پاتے چلے جاتے ہیں۔

''تمنا بے تاب'' کا مصنف اپنی شخصیت کو چھوڑ کر دوسری شخصیات یا فنی کرداروں کی تفصیل میں چلا جاتا ہے حالانکہ وہ کچھ انجام دینے کی قوت سے قاصر بھی نظر آتے ہیں۔خصوصی طور پر جہاں جہاں بھی ''مظہر الاسلام'' کا ذکر ہوا ہے۔ یہ بذات خود نفسیاتی طور اور سطح پر دلچسپی کا حامل ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے گویا مصنف ادب کا دامن چھوڑ کر ایک سخت گیر اور یک رخا مورخ بن بیٹھا ہے۔جوں جوں کہانی آگے بڑھتی ہے۔مصنف خود تو پس منظر میں محو ہوتا جاتا ہے۔اور عصری حالات، خارجی ماحول، معاشرت اور خصوصی طور پر ادبی وملکی سیاست حاوی ہوتی جاتی ہے۔اور قاری سوانح نگار کی نجی زندگی، اسکے تجربات ومشاہدات، رنگ وآہنگ اور جذبات وتخیل سے دور ہو جاتا ہے۔

''تمنا بے تاب'' میں قاری سوانح نگار سے ملنے اور جاننے کی بجائے وہ مصنف کے ذریعے دوسرے لوگوں سے آشنا ہوتا ہے۔البتہ کتاب کے آخری دو سو صفحات اس لحاظ سے خاصے اہم ہیں کہ ان میں سوانح نگار کی ذات کچھ واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔اور قاری خود کو مصنف کے قریب ہوتا محسوس کرتا ہے۔میرا خیال ہے کہ کتاب کے آخری دو سو صفحات اور دیگر چند صفحات ہی اس کا بنیادی حصہ ہیں جبکہ مصنف نے لمبی چوڑی اور بے جا تفصیلات سے کتاب کو مزیّن کیا ہے۔اگر ان تفصیلات کو حذف کر کے دوبارہ ترتیب اور مرتب کیا جائے تو کتاب حال سے زیادہ خوبصورت شکل میں موجود ہوگی۔

یوں لگتا ہے کہ مصنف قاری کو خود سے روشناس کروانے کی بجائے اپنے احباب، اقارب اور اردگرد سے متعارف کروا رہا ہے اور یہ صورت حال خاصی سنجیدگی کی حد تک تکراری صورت اختیار کر جاتی ہے۔اس کی وجہ بھی وہی نفسیاتی خوف، جھجک اور شرم ہی ہوسکتی ہے جو بچپن سے مصنف کے ساتھ چلی آتی تھی۔ بالحاظ مجموعی دیکھا جائے تو اس تصنیف کی خوبصورتی کا راز اس کا کہانی پن ہے جو یک رخا نہیں بلکہ متنوع ہے۔ایک رنگا رنگی سی ہے اور وقت اور تخیل کے ابدی تسلسل اور تبدیلی کی طرح کہانی مختلف موڑ کاٹتی نظر آتی ہے جو اپنے اندر وحدت سمائے ہوئے ہے۔خارج سے داخل، داخل سے خارج اور بے چینی سے اطمینان کا سفر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔واقعات میں ٹھہراؤ نہیں ہے بلکہ مدوجزر کی سی کیفیت ہے جو کبھی صبح خوش، کبھی شام غم، کبھی بادِ سموم اور کبھی بادِ نسیم کی شکل میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر عباس برمانی

رضی الدین رضی کا آدھا سچ

ادیب، شاعر، صحافی، کالم نویس، مزاح نگار، نقاد، تاریخ نویس، سیاسی مبصر۔۔۔۔ جی نہیں میں بہت سارے لوگوں کا تذکرہ کرنے نہیں جا رہا، اکیلے رضی الدین رضی کا ذکر ہے جس کی ذات میں مندرجہ بال خوبیاں یا برائیاں جو بھی کہیے جمع ہوگئی ہیں۔ وہ قریب چوتھائی صدی سے لکھ رہا ہے یعنی جب اس نے لکھنا سیکھا تھا تو محض کسی کا نام لکھنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ شاعری اور نثر نویسی شروع کر دی تھی اس قدر پختہ کہ فرضی ناموں مثلاً سائل انبالوی اور ہوتل بابا کے نام سے لکھی گئی اس کی تحریروں کو لوگ واقعتاً عمر رسیدہ اور پادر گور بزرگوں کی تحریریں سمجھا کرتے تھے۔

اس کی شاعری کی تین کتابیں طبع ہو کر سخنوروں سے داد پا چکی تھیں لیکن نثر کی پہلی کتاب اس نے پیغمبری کی عمر کو پہنچ کر چھپوائی۔ دوستوں نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ میں رضی کی کتاب ''آدھا سچ'' پہ کچھ لکھوں۔۔۔۔ میرے لئے یہ ایک بہت مشکل کام ہے کیونکہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے (اس کی یا میری؟) رضی میرا دوست ہے اور دوست کی کتاب پہ لکھنا۔۔۔۔ رضی کے اپنے الفاظ میں۔۔۔۔ ''ہم دوستوں کی کتابوں پہ بات کرنے سے عموماً گریز ہی کرتے ہیں وجہ یہ کہ اگر کتاب کی تعریف کی جائے تو دوسروں کے علاوہ خود صاحبِ کتاب کا خیال بھی یہی ہوتا ہے کہ حقِ رائے دہی کی بجائے حقِ دوستی ادا کیا جا رہا ہے۔ اگر تعریفی کلمات کچھ کم رہ جائیں (عموماً ایسا ہی ہوتا ہے) تو خوامخواہ اچھے دوست سے بھی محروم ہونا پڑتا ہے۔'' (اشرف جاوید نخل نوا اور لکی ایرانی سرکس)

لیکن صاحبان، رضی نے یہ ایک عمومی رائے کا اظہار کیا ہے ذاتی طور پر وہ ایک بے رحم نقاد ہے اور دوستوں کی تحریروں کو بھی کُند چھری سے ذبح کرتا رہا ہے، چند ایسے دوستوں کو میں بھی جانتا ہوں جن سے وہ اپنی حق گوئی کی عادت کی وجہ سے محروم ہوا ہے۔

رضی نے جب ''آدھا سچ'' ہمارے ایک نقاد دوست کو دی، تو وہ کافی دیر تک کتاب کے ٹائٹل کو گھورتے رہے پھر کتاب ایک طرف رکھ کر بولے ''اے کیڑے چرچ دا فوٹو سی'' ان کا اشارہ ٹائٹل پر موجود قدیم و رفیع ایوانِ عالی شان کی طرف تھا جس کے متعدد بلند و بالا ستون ہیں۔ لیکن دوستو یہ کسی چرچ کی تصویر ہرگز نہیں بلکہ یہ قصرِ ہزار ستون رضی نے دوستوں کو ستونوں کے ساتھ باندھ کر کوڑے مارنے کے لیے تعمیر کیا تھا لیکن بعد ازاں نامعلوم وجوہات کی بنا پر اپنا ارادہ بدل دیا اور صرف آدھا سچ لکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اب آیئے کتاب کے خوبصورت بیک ٹائٹل کی جانب جہاں رضی کی دیگر کتب کے ٹائٹل ہیں اور وہ خود اپنی روایتی شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ براجمان ہے، لیکن یقین کریں کہ یہ کتاب کی واحد

خوبصورتی ہرگز نہیں اس کے صفحات بھی خوبصورتیوں سے مزین ہیں۔ رضی کا وہ اقتباس اس کتاب پہ ہرگز منطبق نہیں ہوتا ''اسی دوران اشرف جاوید سے ملاقات ہوگئی اور جب اس نے ہم سے سوال کیا کہ کتاب کیسی ہے؟ تو ہم نے محض یہی جواب دیا کہ کتاب کا بیک ٹائٹل خوبصورت ہے کیونکہ اس پر اپ کی غزل نہیں بلکہ تصویر موجود ہے'' (اشرف جاوید نخل نوا)۔ آیئے اب ذرا سنجیدگی سے کتاب کی ورق گردانی کریں۔۔۔۔ ایک بڑا واضح تاثر قائم ہوتا ہے کہ رضی ایک روشن خیال، ترقی پسند اور سامراج دشمن سوچ رکھنے والا ادیب ہے، وہ ادب برائے ادب نہیں برائے مقصد کا قائل ہے، وہ کہیں بھی اپنے مقصد اور نظریے سے روگردانی نہیں کرتا۔ اس کا تخلیقی سفر اپنے عہد کے تہذیبی اور سیاسی منظر کو ساتھ لے کر چلتا ہے۔ ثریا شہاب کے ناول ''سفر جاری ہے'' پہ گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے ''سوچنا یہ ہے کہ دورِ آمریت میں چند سر پھروں نے انسانی حقوق اور آزادیوں کے لیے جو لڑائی لڑی تھی کیا وہ اپنے منطقی انجام تک پہنچی؟ یقیناً ایسا نہ ہوا۔ آج جمہوریت کے ثمرات سے بھی وہی لطف اندوز ہیں جنہوں نے مارشل لاء دور میں جمہوریت کے قاتلوں کے ہاتھ مضبوط کئے تھے۔'' نیاز لکھویرا کی کتاب ''ابر، ہوا اور بارش'' پہ پڑھے گئے مضمون میں کہتا ہے:

> ''مارشل لاء دور میں انٹیلی جنس والوں کو ادیبوں کی رپورٹیں بھیجنے والے قلم کار خود کو اب جمہوریت کا چیمپئن کہتے ہیں۔ گیارہ سال تک فوج سے تمام مراعات حاصل کرنے والے ایک ادیب کا کہنا ہے کہ ضیاء دور میں مجھ پر بہت ظلم ہوا ہے۔ شنید ہے کہ مظفر وارثی بھی چند روز میں یہ روز میں یہ دعویٰ کریں گے کہ میں گیارہ سال تک نعتیں پڑھ پڑھ کر آمریت کے خلاف جہاد کرتا رہا ہوں۔''
>
> مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' کے حوالے سے کہتا ہے:
>
> ''ہمیں یہی بتایا گیا کہ سقوطِ ڈھاکہ کے پیچھے ہمارے ازلی دشمن کا ہاتھ تھا، اصل کہانی تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے سے واضح ہوتی ہے، تارڑ نے ہمیں تصویر کا دوسرا رخ دکھایا ہے، تصویر کا دوسرا رخ دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ازلی دشمن کے ساتھ ساتھ ہمارا ایک اصلی دشمن بھی ہے اور یہ اصلی دشمن وہی ہے جسے دشمن کہتے ہوئے ہمارے پر جلتے ہیں'' (راکھ ازلی اور اصلی دشمنوں کی کہانی)۔

اس ''ازلی'' اور ''اصلی'' کی داد تو وہ یوسفی سے بھی لے سکتا ہے۔ ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> ''جاوید چودھری ایک ایسے وقت میں ملتان آیا ہے جب مسلم لیگ اور بدھا کے مجسموں کو ثواب سمجھ کر توڑا جا رہا ہے۔ بدھا کے مجسموں کو طالبان نشانہ بنا رہے ہیں تو مسلم لیگ کے مجسمے پر ہم خیال جنونیوں نے چڑھائی کر رکھی ہے'' (جاوید چودھری اچھا کالم نگار یا مقبول کالم نگار)

اپنے عہد کی ایک بہت بڑی بدنصیبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

''سچ پوچھیں تو اس کتاب نے مجھے خاصا پریشان بلکہ خوفزدہ کر دیا، بار بار دفعہ 295 سی یاد آتی ہے، فی زمانہ ہم جنون کی جس کیفیت سے گزر رہے ہیں اس میں میری یہ پریشانی کوئی غلط بھی نہیں تھی، ہم مذہب کو بھائی چارے کے فروغ کی بجائے نفرتیں تقسیم کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔'' (اللہ میاں سے اختر عباس کی بے تکلفی)۔

رضی کے شگفتہ مضامین میں اس طرح کی تلخ سچائیاں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں لیکن ایسے شیریں پیرائے میں کہ وہ قاری پر پتھر نہیں گلاب کی پتیاں بن کر برستی ہیں۔

اسے جہاں بھی موقع ملا اس نے معاشرے کے ان مکروہ کرداروں کو بے نقاب کیا ہے۔۔۔۔خوشامدی ادیب، قلم فروش کالم نگار، لفظوں کے خریدار بیوروکریٹ شاعر، نفرتوں کے بیوپاری مُلا، کوئی بھی رضی کے نشترِ خامہ کے کچوکوں سے نہیں بچ پایا۔

آج جب پھکڑ پن کو مزاح کا درجہ دے دیا گیا ہے رضی کا شستہ اور شائستہ مزاح شفیق الرحمٰن اور مشاق احمد یوسفی کی روایت کا تسلسل نظر آتا ہے، اس کا طنز محمد خالد اختر کی یاد دلاتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا (تھا) کہ رضی نے بھرپور سچائیوں سے لبریز اس کتاب کو آدھا سچ کا نام کیوں دیا؟ ہاں صفحہ 99 پر ایک جملہ نظر آیا ''عباس ایک روشن خیال انسان ہے، روشن خیال اگر جمہوریت کا قتل بھی کر دیں تو ہم جمہوریت پسند ہونے کے باوجود صدائے احتجاج بلند نہیں کرتے۔''

میں رضی کا دوست ہونے کے حوالے سے جانتا ہوں کہ یہ آدھا سچ ہے۔

نامناسب نہ ہوگا کہ اس مضمون کا اختتام محترم ڈاکٹر انوار احمد کے ان فقروں کے ساتھ کروں:

''مجھے یقین ہے کے رضی الدین کی اس کتاب کو اس کے دوست اور دشمن ایک جیسی امنگ کے ساتھ پڑھیں گے اور اپنے اپنے ظرف کے مطابق محظوظ ہوں گے۔ یہ کتاب نہ صرف تخلیقی اسلوب کے ایک خاص آہنگ سے آشنا کرتی ہے بلکہ ادبی تہذیبی ملتان کو ایک اور انداز میں محسوس کرنے والوں پر منکشف کرتی ہے۔''

☆☆☆

ڈاکٹر شگفتہ حسین

''ملبے میں دبے ہوئے لفظ'' از شاکر حسین شاکر

۸/اکتوبر کے زلزلے میں تباہ ہونے والے ایک اسکول کے ملبے سے ایک لکڑی کی تختی نکلی جس پر قلم سے لکھا تھا ___

''عقاب ایک پرندہ ہے اس کے پر بہت مضبوط ہوتے ہیں۔ کوا ایک پرندہ ہے لیکن اس کے پر مضبوط نہیں ہوتے۔ عائشہ بھی ایک پرندہ ہے اور اس کے پر بہت مضبوط ہیں۔''

ٹیلی ویژن پر اس علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک آدمی یہ تختی دکھاتے ہوئے بتا رہا تھا کہ عائشہ دوسری جماعت کی ننھی منی سی طالبہ تھی۔ جب آٹھ اکتوبر کو زلزلہ آیا تو وہ دوسرے بچوں کے ساتھ باہر کی طرف بھاگی لیکن اس کی تختی اور بستہ پیچھے رہ گیا وہ اٹھانے کے لیے واپس اندر کی طرف لپکی اور گرتے ستون کی زد میں آ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی ___ اپنے مضبوط پروں کے ساتھ اڑان بھرتی دُور بہت دُور معلوم نہیں کہاں ___ نیلے آسمان کی وسعتوں میں کھوگئی۔ تب بے اختیار میرا جی چاہا ___ میں عائشہ کے لیے کچھ لکھوں ___ لیکن مجھ سے ایک حرف بھی نہ لکھا گیا کہ دُکھ کی شدت جو پیرایۂ اظہار مانگتی تھی میرا دامن شاید اس سے خالی تھا ___ لیکن آج جب شاکر حسین شاکر کی کتاب ''ملبے میں دبے ہوئے الفاظ'' پڑھی تو اپنی کم مائیگی کا احساس دو چند ہو گیا اور یہ بھی احساس ہوا کہ واقعی یہ کام انہی کا ہے جن کے حوصلے ہیں زیاد۔! شاکر حسین شاکر نے ۸/اکتوبر کے سانحے کو اپنے افسانہ نما کالموں میں جس طرح سمیٹا ہے وہ انہی کا حوصلہ ہے۔ لہولہو روتی یہ تحریر تادیر زلزلہ زدگان کو ہمارے ساتھ رکھے گی اور یہی اس تحریر کی رضا اس کی منشا ہے۔

کتاب کے مصنف ملتان کی ادبی فضاؤں کا معروف نام ہیں۔ شاعر آدمی ہیں اور شاعر جس حساسیت سے معمور ہوتا ہے اسی حساسیت نے ان سے یہ کالم لکھوائے ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں کہ یہ سب وہ خود نہیں لکھ رہے تھے کوئی تھا جو شاکر حسین کے وجود میں بیٹھا فطرت کے اس قہر اس صبر پر نوحہ خواں تھا، جس کے نوحوں نے کالموں کا روپ دھار لیا۔ کسی واقعے کی شدت سے متاثر ہو کر اس کیفیت میں ڈوب جانا اور پھر اپنے احساسات کو اپنے اندر کے تخلیق کار کے سپرد کر کے فن پارہ تخلیق کر دینا ___ تخلیقی عمل کہلاتا ہے، لیکن Detachment کا یہ عمل کسی ایک ہی سانحے یا واقعے کے لیے ایک فن پارہ تو تخلیق کرا سکتا ہے ___ لیکن دس کالم لکھنے کے لیے دس مرتبہ ایک ہی درد، ایک ہی کرب، ایک ہی اذیت سے گزرنا ___ یہ تو روز جینا اور روز مرنا ہوا ___ اتنی ہمت ___ اتنی شکستی کہاں سے پائی شاکر حسین کے

دل نے ___ یہ کچھ اتنا آسان تو نہ تھا لہو رونا ___ وہ شاکر حسین جو صرف یہ دعا مانگے ___ ''مولا کوئی غم نہ دینا غم حسینؓ کے سوا'' ___ اس نے اتنا سارا غم اپنے سینے میں کیسے اُتارا ___ ؟ اور پھر اس غم کی سہار کیسے کی ___ ؟؟

''میرے خدا مجھے میری ماں کی عبادت واپس کر دے۔ وہ عبادت جو وہ ہماری سلامتی کے لیے کیا کرتی تھی۔ جب تو نے وہ عبادت قبول ہی نہیں کی۔ تو اب وہ تیرے کس کام کی؟'' (ملبے میں دبے ہوئے لفظ)

''متاثرہ علاقوں میں جوان لڑکیاں عزتیں بچانے کے لیے اب خودکشیاں کر رہی ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے قیامِ پاکستان کے وقت لڑکیوں نے ہندوؤں اور سکھوں سے بچنے کے لیے کنوؤں میں چھلانگیں لگائی تھیں۔ افسوس ناک بات یہ ہے عزتوں کے لٹیرے اس مرتبہ ہندو یا سکھ نہیں ہیں۔'' (کبھی ہم بھی خوبصورت تھے)

''زمین نے گرم ہو کر پہلے تباہی مچائی تھی۔ اب وہ موت اوڑھ کر ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ سردی اور برف باری بھی لوگوں کو اس لیے زیادہ محسوس ہو رہی ہے کہ زمین بے وفا ہو گئی ہے۔ زلزلے نے پوری قوم کو جگایا تھا، لیکن اس قوم کا جاگنا عارضی تھا وہ ایک بار پھر سو گئی ہے۔'' (اہلِ وطن ابھی آپ نے سونا نہیں ہے)

عام طور پر ایسے لرزا دینے والے سانحات سے متاثر فوری تخلیق ہونے والا ادب ہنگامی اور وقتی کہلاتا ہے، لیکن شاکر حسین شاکر کے یہ ملبے تلے دبے ہوئے الفاظ ہنگامی اور وقتی ہونے کے باوجود زمان و مکاں کی حدود سے ورا اعلیٰ فن پاروں کی صف میں شامل ہیں۔ کبھی جب صدیوں کے بعد کوئی آرکیالوجسٹ وادیوں میں دفن بالاکوٹ اور باغ کے ننھے بچوں کی اجتماعی قبریں دریافت کر لے گا تو وہیں کوئی تاریخ ادب کا عالم ملبے تلے دبے ان لفظوں کو بھی ڈھونڈ نکالے گا جو ایک طرف فطرت کے جبر اور دوسری طرف کچھ اپنوں کی بے حسی پر نوحہ کناں ہیں۔

☆☆☆

احمد فراز

دل یہ بھی چاہتا ہے ہجراں کے موسموں میں
کچھ قربتوں کی یادیں ہم دور پار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے اُن پھول سے لبوں کو
دستِ صبا پہ رکھ کر کلیوں کا پیار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے اس جانِ شاعری کو
کچھ شعر اپنے چن کر اک شاہکار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے سب بھید چاہتوں کے
ہر مصلحت بھلا کر بے اختیار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے پردے میں ہم سخن کے
دیوانگی کی باتیں دیوانہ وار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے جب بے اثر ہے سب کچھ
تجھ کو بنا کے قاصد اے یارِ یار بھیجیں

دل یہ بھی چاہتا ہے یا چپ کا زہر پی لیں
یا دامن و گریباں ہم تار تار بھیجیں

دل جو بھی چاہتا ہو لیکن فرازؔ سوچو
ہم طوقِ آشنائی کیسے اُتار بھیجیں

احمد فراز

اس کا سراغ کب کسی تعبیر سے ملا
اک اور خواب خواب کی تعبیر سے ملا

اب بختِ نارسا سے کریں کیا شکایتیں
جب تجھ سا دوست بھی ہمیں تقدیر سے ملا

دہلیزِ خسرواں سے عبث خوش گماں ہے تُو
انصاف کس کو عدل کی زنجیر سے ملا

اب کیوں شکستِ شیشۂ دِل پر ہے نوحہ گر
جا اور اپنا نام و نسب میر سے ملا

ہم اہلِ دل نہ بدلے نہ بدلیں گے ناصحا
کیا فائدہ تجھے تری تقریر سے ملا

تا تجھ پہ بھی کُھلے ترا عجزِ سخن فرازؔ
تو اپنے شعر یار کی تصویر سے ملا

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

اعتبارِ مہ و ستارہ نہیں
دیکھئے کیا کہ خوابِ تازہ نہیں

ہم بھی تکتے ہیں آئینوں کو بہت
پاس اپنے بھی ناک نقشہ نہیں

دل کو جو چاہے لوٹ کر لے جائے
اس خزانے پہ کوئی پہرہ نہیں

اُس سے ہوگی بھلا محبت کیا
جس کے اندر ہوس زیادہ نہیں

جیسے کرتا ہے کوئی ، کرتا رہے
عشق ہے یہ کوئی طریقہ نہیں

سب کے ہوتے ہیں اپنے اپنے رنگ
جیسے لگتے ہیں ایسے سادہ نہیں

ایک لمحے میں کتنی صدیاں کبھی
کبھی صدیوں میں ایک لمحہ نہیں

کہیں دستار ہے تو سر غائب
کہیں فرہاد ہے تو تیشہ نہیں

کہیں دیوار ہے تو در معدوم
کہیں آئینہ ہے تو چہرہ نہیں

ایسے بیٹھے ہیں سب گنوائے ہوئے
ایسا لگتا ہے کوئی صدمہ نہیں

کیا سنائیں کسی کو قصۂ فقر
داستانِ امیر حمزہ نہیں

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

چلیں گے جانبِ منزل ذرا سا دَم لے کر
ابھی رُکے ہیں کڑے کوس کے قدم لے کر

وہاں پہ بیٹھے ہیں ہم ایسے سیدھے سادے لوگ
گزر رہا ہے زمانہ جہاں سے خم لے کر

کہیں چراغ بدلنے کو ہی نہ آیا ہو
جو خوشیاں بانٹ رہا ہے ہمارے غم لے کر

ہماری خُو بھی وہی طرزِ گفتگو بھی وہی
بدل گئے ہو تمہی ہم سے اِک قسم لے کر

بہت سے جامِ سفالیں ملے مگر بے سُود
ہم اَب کے دیکھتے ہیں کوئی جامِ جم لے کر

☆☆☆

خاورؔ اعجاز

مری وفا کا ہوا امتحان تھوڑی دیر
زمینِ دل پہ رہا آسمان تھوڑی دیر

ملیں گے سرحدِ معدوم کے کناروں پر
یہ زندگی ہے ابھی درمیان تھوڑی دیر

پھر اگلا مرحلہ تھا اعتبارِ ہستی کا
رہے میانِ یقیں و گمان تھوڑی دیر

بدل رہا ہے یہ قرب و جوار کا موسم
نواحِ جاں میں رکو میری جان تھوڑی دیر

سنو تو بات میرے دل کی ایک پَل کے لیے
رکھو تو طاق میں تیر و کمان تھوڑی دیر

خاورؔ اعجاز

تُو جو آتا ہے تو میخانے میں آ جاتے ہیں
ہم تو ناصح ترے بہکانے میں آ جاتے ہیں

بات چلتی ہے جو پیراہنِ خوشبو سے ترے
رنگ کیا کیا مرے افسانے میں آ جاتے ہیں

عکس تو اور ہی آئینے میں رہ جاتا ہے
ہم کسی اور پری خانے میں آ جاتے ہیں

ڈھونڈتے ڈھونڈتے اِک گوشۂ عافیت کو
شہر والے مرے ویرانے میں آ جاتے ہیں

پھول کھلنے کا جب آ جاتا ہے موسم نزدیک
تیرے جلوے ترے دیوانے میں آ جاتے ہیں

خاورؔ اعجاز

وحشتِ شوق نے کیا کیا نہ اذیت کھینچی
ہار کر ہم نے زمانے سے طبیعت کھینچی

ٹوٹ جاتا ہے مرا خواب جو کھل جاتی ہے آنکھ
اَب کے سویا ہوں تو بس حشر کی نیّت کھینچی

پھر کوئی اور نہ آ پائی مقابل اس کے
کربلا تُو نے جو تصویرِ حریّت[1] کھینچی

عقل دم توڑتے کچھ اور ہی کہتی تھی مگر
عشق نے اور ہی صورت کی وصیت کھینچی

مجھ کو پوچھا بھی نہیں، اپنی طرف ہی اُس نے
روزِ اوّل سے زمامِ ابدیّت کھینچی

[1] ضرورتِ شعری

☆☆☆

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

ہو چکیں صورت حالات کی تفسیریں بھی
حوصلہ ہار گئیں آہنی تدبیریں بھی

لفظ و معنی سے عبارت نہیں لذت کا حصول
ان سے مقصود ہے تبدیل ہوں تقدیریں بھی

کتنا منہ زور ہے تہذیب کا وحشی توسن
ٹکڑے ٹکڑے ہیں نظریات کی زنجیریں بھی

حق کی تائید مٹا دیتی ہے باطل کا غرور
عزم راسخ کو جھکاتی نہیں تعزیریں بھی

جب تضادات کی تاریک فضا طاری ہو
کام آتی نہیں وجدان کی تنویریں بھی

جوہری عہد نہتوں کے لیے قاتل ہے
ایک ہو جائیں تو جوہر کا جگر چیریں بھی

اختلافات سے مر جاتا ہے انساں کا شعور
ہوش اُڑ جائیں تو بے کار ہیں شمشیریں بھی

اب کے اس رنگ سے رخصت ہوا احساس جمال
لے گیا یاد کی محراب سے تصویریں بھی

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

تجربے وقت کے ساتھی ہیں بگڑ جاتے ہیں
کتنے رخنے ہیں جو دیوار میں پڑ جاتے ہیں

غمزدہ عرض بھی کرتا ہے اگر درد کی بات
حکمرانوں کا وتیرہ ہے اکڑ جاتے ہیں

دھوپ میں پھرتے ہیں بے آسرا کشکول لیے
در بدر پھرتے ہوئے آبلے پڑ جاتے ہیں

زندہ رہنا جنہیں آتا نہیں غربت کے سبب
موت آنے سے بہت پہلے ہی سڑ جاتے ہیں

بے وسیلوں میں بھی طاقت کا ہے صدرنگ وجود
سازشی عہد کے عفریت سے لڑ جاتے ہیں

زرد پتوں پہ ہی موقوف نہیں جبر زوال
سبز پتے بھی تو طوفان میں جھڑ جاتے ہیں

عزم کے پاؤں میں زنجیر نہیں پڑ سکتی
یہ ہیں وہ پاؤں جو پتھر میں بھی گڑ جاتے ہیں

کچے دھاگے سے جنہیں باندھ کے لائے ہیں خیالؔ
حرص کی گود میں گرتے ہی بچھڑ جاتے ہیں

☆☆☆

شارقؔ بلیاوی

نظر میں کرب لبوں پر فغاں نہیں رکھتا
میں آگ رکھتا ہوں لیکن دھواں نہیں رکھتا

ہوں معتقد میں یقیں کا یا لایقینی کا
نصاب زیست میں کوئی گماں نہیں رکھتا

جو سچ کہوں تو سماعت کو ناگوار لگے
جو جھوٹ بولے میں ایسی زباں نہیں رکھتا

حروف میرے ہیں روشن کھلی کتاب ہوں میں
یہی سبب ہے کوئی راز داں نہیں رکھتا

جو بات کہنی ہو لکھ لیتا ہوں میں چہرے پر
ہر ایک بات کا شوقِ بیاں نہیں رکھتا

یہ زندگی ہے ، محبت ہے ، نامرادی ہے
علاوہ اس کے کوئی داستاں نہیں رکھتا

نہ ہونے سے ہے بڑا دُکھ جو ہو کے مٹ جائے
خدا کا شکر ہے میں آشیاں نہیں رکھتا

زباں تو کام بھی لیتی ہے مصلحت سے مگر
بشر کا چہرا تو کچھ بھی نہاں نہیں رکھتا

☆☆☆

شارقؔ بلیاوی

معتبر ابنائے عالم کا فسانہ ہم سے ہے
ہم ضرورت ہیں زمانے کی زمانہ ہم سے ہے

مسکراتے یہ مناظر گنگناتے آبشار
لب پہ فطرت کے محبت کا ترانہ ہم سے ہے

ہم نہ ہوتے تو اُترتا رزق کس کے واسطے
یہ زمینِ خشک و تر یہ آب و دانہ ہم سے ہے

عشق کی افسوں نگاہی کو ترستا ہے جمال
حسن والوں کی ادائے دل برانہ ہم سے ہے

ہم ہی بُنتے ہیں حسیں پیراہنِ افکارِ زیست
عظمتِ انسانیت کا ہر فسانہ ہم سے ہے

ہم نے ہی اجزائے شئے کو نت نئے چہرے دیئے
گفتگو کارِ جہاں پر ناقدانہ ہم سے ہے

تِنکا تِنکا چن کے ہم نے ہی سجایا شاخ پر
اس طرح آباد شارقؔ آشیانہ ہم سے ہے

حصیرؔ نوری

ڈوبنا کیا ہے کیا اُبھرنا ہے
اس سفر کو تمام کرنا ہے

ان کے دکھ سکھ کو جانیے اپنا
ساتھ میں جن کے جینا مرنا ہے

ٹوٹ جائیں گی ساری زنجیریں
حادثہ سانس پر گزرنا ہے

آدمی اک کھلونا ہے جس کو
ٹوٹنا ٹوٹ کر بکھرنا ہے

راہِ ہستی میں موڑ ایسے ہیں
مشکلوں سے جہاں گزرنا ہے

چار دن چاندنی ہے حیات
اور پھر غار میں اُترنا ہے

چھوڑ کر ایک دن یہ باغ حصیرؔ
دستِ تاریک سے گزرنا ہے

حصیرؔ نوری

اپنی خوشیوں میں اپنا گھر رکھنا
دکھ کا احساس بھی مگر رکھنا

مصلحت ہے کہ مسکنوں سے دُور
کوئی سایہ سرِ شجر رکھنا

عہدِ حاضر میں باکمالوں پر
رشک کرتی ہوئی نظر رکھنا

بات کرنا تو بات کرنے میں
حرف و معنی کو معتبر رکھنا

شام ہی سے دیے جلا دینا
تیرگی میں نہ اپنا گھر رکھنا

میں سماؤں گا روح کے اندر
چشم کے در کو کھول کر رکھنا

اقتضا وقت کا یہی ہے حصیرؔ
عکس و آئینہ پر نظر رکھنا

☆☆☆

غفار بابؔر

سنگِ گراں یہ دل پہ اُٹھانا پڑا مجھے
آئینہ دوستوں کو دکھانا پڑا مجھے

بڑھنے لگی جو حد سے شبِ غم کی تیرگی
پلکوں پہ اِک چراغ جلانا پڑا مجھے

پھر سے وہ دیکھنے کو تیرا ''مڑ کے دیکھنا''
آواز دے کے تجھ کو بلانا پڑا مجھے

رُخ سے تیرے نقاب کو میں نے اُلٹ دیا
یوں چاند کا غرور بجھانا پڑا مجھے

دستک تُو دے سکا نہ دَرِ حُسن پر کبھی
واپس تجھے بھی عشق بُلانا پڑا مجھے

''دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی''
آنا پڑا اُسے کبھی جانا پڑا مجھے

حائل نہ ہو کہیں یہ ہمارے ملاپ میں
سایہ بھی درمیاں سے ہٹانا پڑا مجھے

تَر ہو گیا ہے گریۂ پیہم سے اِس قدر
دامن کو بارشوں سے بچانا پڑا مجھے

یاروں کے رُخ پہ حرفِ ندامت نہ پڑھ سکا
بابؔر چراغِ شب کو بجھانا پڑا مجھے

☆☆☆

غفار بابؔر

لوگوں نے اگر چاند کو تسخیر کیا ہے
میں نے بھی تیری زلف کو زنجیر کیا ہے

شاید کوئی ممتاز محل جھانک لے اِس میں
اِک تاج محل دل میں جو تعمیر کیا ہے

یہ فن بھی دیا ہے مجھے نقّاشِ ازل نے
میں نے جو تصور کو بھی تصویر کیا ہے

اربابِ قلم جس پہ ہیں انگشت بدنداں
اِک حرفِ سخن میں نے وہ تحریر کیا ہے

ہر خواب کو دیکھا ہے حقیقت کی نظر سے
ہر خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا ہے

جو پھول محبت کے یہاں بانٹ رہا تھا
کس نے اُسے آمادۂ شمشیر کیا ہے

کس منہ سے تیرا شکر بجالاؤں کہ تُو نے
غم دے کے مجھے صاحبِ جاگیر کیا ہے

بابؔر یہ کرامت ہے کسی اہلِ نظر کی
جس نے کہ جوانوں کا مجھے پیر کیا ہے

اصغر علی شاہ

التشبیب فی ھجو النسیب

خدا نے لکھ دیئے عاشق مزاج کیا کیجے
جز اب کہ کہیے غزل ، اور کاج کیا کیجے

یقینی بھی نہ رہی اب نجابتِ ممدوح
قصیدہ بھی نہ رہا بس میں آج ، کیا کیجے

بنے ادیب تو بنیوں کے پیر لیجے کہ اب
یہ مول بھی نہ ملے بن بیاج ، کیا کیجے

ہو اختصار سے منثور مدح بالتکرار
کہ نقلیوں کے یہی ہیں مزاج ، کیا کیجے

صلے کے واسطے اب بھی نئے سخنور ہم
نباہتے ہیں پرانے رواج ، کیا کیجے

قدیم طرز کی غلمان کورنش کے ساتھ
مزید یہ بھی ہے دیجے خراج ، کیا کیجے

زمینِ شعر میں پھر جنس بیچئے کہ رہا
مذاقِ آدم و حوّا اناج ، کیا کیجے

بتایئے کہ ہزاروں برس ہوئے اب تک
اُسی لگن سے بھڑکتی ہے کھاج ، کیا کیجے

خبر بنا کے اسے پوچھئے زمانے سے
کہ ایسے نسلی مرض کا علاج ، کیا کیجے

فقط مریض نہیں ہم ، لپیٹ میں اس کی
جتایئے کہ ہے پورا سماج ، کیا کیجے

دہائی دیجیے اِک اندھے دیو بچے کی
ہیں ٹھوکروں میں کماروں کے تاج ، کیا کیجے

اسی پہ بس نہیں ، کہیے کہ روز ہی ہم سے
یہ مانگتا ہے لہو کا خراج ، کیا کیجے

سوال کیجیے سنسار باسیوں سے سدا
کہ کامراج ہوا سامراج ، کیا کیجے

انہیں سے پوچھئے ، تدبیر ، ماسوا اس کے
کہ بار بار کریں احتجاج ، کیا کیجے

ہوا یہ ضعف کہ دائم دماغ گھومتا ہے
لگا ہے دل کو سدا اختلاج ، کیا کیجے

خدا بچائے مگر چند ماہ میں ہوگا
کہ بیاہ نام سے آئے گی لاج ، کیا کیجے

وہ نیک بخت کنواری مرے گی ، جس سے بھی
کیا بھرم کے لیے ازدواج ، کیا کیجے

کہ اپنے نام کا خانوں میں مرد عورت کے
نہ ہو سکے گا کہیں اندراج ، کیا کیجے

نہ اپنی کھیتی میں اب برسیں ، بنجروں میں سدا
رہے برستے بلا احتیاج ، کیا کیجے

رہا برستا کرم ابر رات دن ، برسوں
رہا برستا یہ مینہ چھاج چھاج ، کیا کہیے

ہم ایسے سیدھوں نے جو کج سلوک اپنایا
ہوا ہے نقش وہی الموجاج ، کیا کہیے

بگڑ گئے ہیں تو اس کی دلیل یہ دیجے
کہ عام ہو ہی چلا ہے رواج ، کیا کہیے

تہوں میں ذہن کی چھپ کر بھی تو نہ صاف رہا
بتا او فکرِ مکدّر زجاج ، کیا کہیے

خیال ہی سے گر اعصاب میں تناؤ ہو
کوئی بتائے بجائے مساج کیا کہیے

ہزاروں رنگ کشش ہم نگاہ والوں کو
قدم قدم پہ جو دیتے ہیں ڈاج ، کیا کہیے

مہاجنوں سے سوا ہے سُناریوں کا ستم
بغیر مول لیے ہیں بیاج ، کیا کہیے

جو آپ بیتی ہو ، کہیے بنا کے جگ بیتی
کہ سچ میں جھوٹ کا اب امتزاج کیا کہیے

زباں ملی ہے تو ایسی صداقتیں اب بھی
اگر بیان نہ کیجے تو آج کیا کہیے

☆☆☆

اصغر علی شاہ

ایک کیفے

کرسیوں پر جنگجو
ہر میز گویا مورچہ
مورچہ جس میں نہیں محفوظ کوئی بھی جواں
ایک دشمن کے مقابل ایک دشمن صف بصف
چند بالشتوں کے طول و عرض میں یہ رزم گاہِ مختصر
سگرٹوں کی آگ برسائیں، دھواں پھیلائیں توپوں کے دہن
کچھ پیادے کھیل کی شطرنج کے
کچھ بزعمِ خویش میدانِ سیاست کے سوار
کچھ کوائف کے لیے پرچہ نویس
چند پتّے شاعری کے تاش کے شاہ و غلام
زیست اور زر کا تبادل کرنے والے چند انشور نسیے
چند جیسے جنگ میں مالِ غنیمت کے شریک

ایک پنکھے سے اُڑاتے آجر و ماجور مجلس کی ہوا
مات کھاتے ہیں اگر شاطر تو اپنی چال پر

گرچہ ان سب کا ہے اک دشمن مگر
زیست کی خاطر دعا گو داعیانِ موت ہیں

اپنے ہونٹوں میں دبائے آگ رہتے ہیں سبھی
اور پھر اخبار میں لگتی ہے سرخی

پیالیاں بھر بھر کسیلا زہر پیتے ہیں سبھی
''وقت کو ہم سب نے مل کر مار ڈالا ہے''

حدت و تلخی کو خنکی اور حلاوت جان کر
مگر

موت کا آمیزہ اپنے ہاتھوں کھاتے ہیں سبھی
کون جانے

بحث کی بوچھاڑ اک دوجے پہ دشمن کی بجائے
قتل گاہِ وقت ہے یا مقتلِ افراد ہے

ہے ہر اک مصرع کے راکٹ کا نشانہ ہم نشیں
ایک کیفے ہے

ہر کھلاڑی گول کرتا ہے تو اپنی ہی طرف
کہ لمبے مرثیے میں مصرعِ فریاد ہے

☆☆☆

احمد صغیر صدیقی

شاعری

میں دیکھتا ہوں
سمٹتا ہوا کہیں خود کو
(وجود و ہست کا دریا
بس ایک گھونٹ)
معاً
صراحی مجھ کو پکڑتی ہے
سرخ ہاتھوں سے
اُنڈیل لیتی ہے
اک تنگ حلق میں
''غٹ۔۔غٹ''
رگوں میں دوڑنے لگتا ہے آسماں سارا
خلا کی بنچ پہ آ بیٹھتا ہے
آنکھوں میں
بہت سے خواب کئی منظروں کے رنگ لیے
سیاہ سایہ
اندھیرے ورق پہ لکھتا ہے
ستارے، چاند، دھنک، کہکشائیں اور سورج

☆☆☆

ندیم ساحلؔ

سارا شگفتہ سے براہِ راست

کئی سجدے قلم برداشتہ ہو کر
تمہارے بے ردا لفظوں کے کعبے میں
طوافِ خواب کرتے اور تہی تعبیر رہتے ہیں
قبا کی وادیِ پوشاک میں عفت
ہوس کا ماتمی احرام پہنے
تمہیں آواز دیتی اور گاہک ڈھونڈ لیتی ہے
اگر الہام ہاتھوں کے علاقے تک نہیں آیا
قلم بیساکھیاں ہیں
فلک کے چھید پہ آنکھوں کے مرہم کون رکھتا ہے
سنو سارا
مجھے آفاق کے شمشان گھاٹوں سے صدائیں آ رہی ہیں
زمیں کے رحم میں کس نے یہ انسانی صحیفہ
امانت میں رکھے دفنا دیا ہے
انہی شمشان گھاٹوں پر مری تاریخ نے کتنے کتب خانے چتائیں کر دیئے تھے
تمہاری قبر پہ آ کر
وہی سارے کتب خانے
تمہارا عرس کرتے اور ننگے بین کرتے ہیں
مورّخ کی دھمالوں پر
فلک حیران ہوتا ہے
تمہارے ماسوا
ادراک کی دنیا میں
انسانی صحیفے کا
پیمبر کون اُترا ہے

☆☆☆

مشتاق شبنم

کون دہشت کا مرتکب ہے

فضائے ویراں سے ایک وحشت
ٹپک رہی ہے
لہو کے تھالے جگہ جگہ ہیں
تمام پتھریلی سرزمیں پر
لہو سے تاریخ بربریت لکھی ہوئی ہے
کہیں پہ لاشیں جلی ہوئی ہیں
کہیں پہ لاشوں کے چیتھڑے سے پڑے ہوئے ہیں
کہیں پہ سر ہے کہیں پہ دھڑ ہے
کہ جیسے قصاب کی دکاں ہو

فضا میں ہے آہنی پرندوں کا شور اتنا
کہ کوئی آواز بھی کسی کو سنائی کیا دے
دھواں فضاؤں میں اس قدر ہے
کسی کی صورت دکھائی کیا دے
عدالتیں ہیں نہ منصفی ہے
ستم رسیدہ دکھائی کیا دے

حواس خمسہ کی تاب وتب پر
دھواں ہے بارود کا مسلط
ہر ایک زندہ بدستِ مردہ ہے دم بخود ہے
نہ سن رہا ہے، نہ کہہ رہا ہے
لہو بہر سمت بہہ رہا ہے

کہیں نمود ونمائش اقتدار کی
رزم گہہ سے سیلابِ کوں امنڈ کر

زمیں کی سطحوں پہ جم گیا ہے
کہیں ہوس کار خواہشوں کی
نگہ سے شعلے اُبل رہے ہیں
کہیں پہ اسباب مال زر کی ہے لوٹ جاری
کہیں دہائی
کہیں بدھائی
ہے چشم گریاں دہن ہے خندہ
عجب تضادات کی گھڑی ہے
فضا سے آہن بدوش شعلے
اُتر رہے ہیں
زمین زرخیز کی نمو کو
زمیں کی سطحوں سے
دھو رہے ہیں
جو جسم بے جان جا بجا ہیں
وہ کرگس وزاغ کی غذا ہیں
نگاہِ کہسار جھک گئی ہے
زمینِ سنگلاخ رو رہی ہے
صدائے نوحہ ہواؤں میں ہے
صدائے ماتم ہے جھونپڑوں میں
لہو کا سیلاب ہر طرف ہے

یہ لاش جو بے کفن پڑی ہے
لہو سے جو غسل کر رہی ہے
یہ لوگ وہ تھے کہ جن کا کوئی
ہوس سے رشتہ کبھی نہیں تھا
نہ تاج کی آرزو تھی ان کو
نہ تخت کی جستجو تھی ان کو
وہ عام انسان تھے جو محنت سے
اپنی روزی کما رہے تھے
حیات کی سختیوں سے اپنی
کسی طرح سے نبھا رہے تھے
جو اپنے تاریک گھر کے گوشوں میں
اپنی شریان کے لہو سے
چراغ گھر کے جلا رہے تھے

وہ گاؤں جن کو تمہارے بمبار نے مٹائے
وہ شہر جن کو تمہاری سفاک خواہشوں نے
جلا دیئے ہیں
وہ لوگ مرگِ ناگہاں کے قتیل ٹھہرے
یہی تھے کیا وہ!
کہ جن پہ دہشت کا جرم رکھ کر
سزاؤں کا مستحق بنا کر
جو خونِ ناحق بہا رہے ہو
تو یاد رکھو
مورخِ وقت کی نظر سے
وہ خونِ ناحق نہاں نہیں ہے
تمہاری دہشت کا شاخسانہ
تمام دنیا پہ مشتہر ہے
مگر تمہیں اس کی کب خبر ہے

مورخِ وقت جانتا ہے
کہ کون دہشت زدہ یہاں ہے
کہ کون دہشت کا مرکب ہے!

☆☆☆

روش ندیم

غارِ ثور سے کائنات کا نظارہ

انا مکا! بات ایسی آسان بھی نہیں تھی
میں کیسے تاریخ کے رجسٹر کو تار تار کر کے
گئے زمانوں کے کوڑے دانوں میں پھینک آتا
اور اپنی مرضی سے اک نئے دودھیا ورق پر میں اپنا ماضی بکھیر دیتا
کہ میں جو تاریخ کی شرارت
اسی کی شوخی کا شاخسانہ
اور یہ تاریخ!!
مشیت ایزدی کی کوئی نامکمل سی ایک تمثیل
خدا کی مٹھی سے دھیرے دھیرے پھسلتی جاتی کسی کہانی کی چند سطریں
میں اس کا مدفن ہوں یا نتیجہ
میں اس کا فنکار ہوں کہ فن ہوں
ازل سے جاری کسی ڈرامے کا کوئی ہیرو
کہ بس اضافی سا کوئی کردار

انا مکا! بات ایسی آسان بھی نہیں تھی
سو میں اُٹھا اور ہاتھ جھاڑے
ذرا سا چوگرد میں نے دیکھا
بڑی خموشی سے اس زمان و مکاں کے جھنجھٹ سے لوٹ آیا

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

دو نظمیں

حرفِ حرمت

حرف رکھتا ہے بے پناہ انا!
جو قلم کار
حرف چادر کو
جھوٹ کی اوڑھنی بناتا ہے
اس سے وہ انتقام لیتا ہے!
اس کی تحریر بے اثر کر کے
حرف ___ توقیر چھین لیتا ہے
خود ہی بن جاتا ہے
کفن اس کا
اس کو زندہ ہی گاڑ دیتا ہے

تجربہ ضروری ہے

قتل ہونے سے تو
مفر ہی نہیں
بس دعا یہ رہی
مرا قاتل
جرم جور و جفا کا عادی ہو
(قتل پہلے بھی کر چکا ہو کوئی)
کام کیسا بھی ہو
مگر
اس میں
تجربے کی ہے اپنی اہمیت

☆☆☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

اس بار دو شمارے (۳۶-۳۵) ایک ساتھ ارسال کر کے آپ نے مجھے مالا مال کر دیا___
ہم دور آباد لوگ ادب کی شاد آباد بستیوں سے آنے والے تر و تازہ جھونکوں کے اس لیے بھی منتظر رہتے ہیں کہ تازہ تر تخلیقی رجحانات کی مہکار ان کے دامنِ اعتبار میں ہوتی ہے جیسے منٹو سیمینار نمبر پڑھ کر ایک مختلف زاویے سے آشنائی ہوئی___ مجھے خالد فیاض کی یہ بات بہت اچھی لگی کہ منٹو کے ادبی قد کاٹھ کے موازنے لاحاصل ہیں ایسی بے سروپا بحثوں سے ہی کج بحثی کے دروازے کھلتے ہیں۔ داغستان کے دانشور شاعر رسول حمزہ توف نے کیسی سچی بات کہی تھی___

''جب کوئی تخلیق کار اپنے شہپارے وقت کی امانت بنا دیتا ہے تو اس کی اہمیت کا فیصلہ وقت ہی کیا کرتا ہے، لوگ نہیں___ وقت جو اپنی امانتوں کو کبھی بے وقعت نہیں ہونے دیا کرتا اور جس کا ہر فیصلہ لاگ اور لگاؤ سے ماورا ہوا کرتا ہے___''

ایک بات اور بھی ہے منٹو کے حوالے سے دو گروپ بن گئے ہیں اور ہمارے نقاد پہلے کوئی گروپ جائن کرتے ہیں پھر اس کی آواز میں مزید طاقت پیدا کرنے کی سعی میں پٹی پٹائی لکیر پیٹنا شروع کر دیتے ہیں___ اب ان سیمینارز میں زاویہ نظر اور قرینہ فکر کی تازگی اور اختلاف تو سامنے آیا___ میں اسے یوں اہمیت دیتا ہوں کہ تازہ ہواؤں کی خنکی میں تر و تازگی کے ساتھ ساتھ صحت افزا رویوں کی کمک بھی شامل ہوا کرتی ہے۔ مجھے یاد آ رہا ہے___ یہاں ایک بار ڈاکٹر خیال امروہوی سے بات ہو رہی تھی تو انہوں نے بڑی حقیقت افروز بات کہی تھی۔ ''شاہ جی! ہم لوگ بنے بنائے راستوں کے مسافر ہوتے جا رہے ہیں۔ بھیڑ چال ہمارا قومی رویہ ہو گیا ہے۔ حقائق کے تلخابے ہمارے حلق سے نہیں اترتے کہ ہم شوگر کوٹڈ جھوٹ اور منافقت کی مٹھاس کے عادی ہو گئے ہیں___ جادۂ نو تراشنے اور زندگی کو مختلف انداز سے دیکھنے کی روش سرخروئی کی ضمانت ہوا کرتی ہے___ ہم اپنی تساہل پسندی اور کوتاہ نظری کی بناء پر بہادرانہ طرزِ زیست سے ناآشنا ہو چکے ہیں___ بس ایک بھگدڑ مچی ہوئی ہے جسے ہم نے ترقی کا نام دے رکھا ہے___ یہ جاہلانہ تمدنی رویہ ہمارے ادب کا بھی بیڑہ غرق کیے دے رہا ہے___ وہاں بھی کوئی صاحب الرائے، صائب الرائے ہونے کی جرات نہیں کرتے۔ سب پہلے سے بنے بنائے مورچوں میں بیٹھے لفظوں کے تیر پھینکے جا رہے ہیں___ کوئی یہ نہیں سوچتا ہمارا منصبی تقاضا کیا ہے؟ اور ہم کہاں تک اس سے وفا کر رہے ہیں؟''

سید عامر سہیل! آپ نے شمارہ ۳۶ میں ''چند باتیں'' کر کے پھر انہی زخموں کو ہوا دے دی ہے___ خواب دیکھنا بھی ضروری ہیں مگر یہ ان آنکھوں کا حق ہے جن میں تعبیروں کی آرزوئیں انقلابی قوت کے ساتھ موجزن ہوں خواب اور انقلاب کے باہمی تعلق سے ہی زندگی تابندگی بنتی ہے مگر جن کے ہاں فقط خواہشیں

ٹھاٹھیں مارتی ہوں وہاں حیات کا اثبات کیسے ہو؟ فقط خیال و خواب تو خیالِ خام ہی ہوا کرتا ہے مگر وہ کہ جن کے دِلوں میں نئی صبحوں کی اُمنگیں جاگتی ہوں اور جن کی دھڑکنوں میں روشن دنوں کے ارادے تڑپتے ہیں وہ انہی خوابوں کو سدا بہار گلابوں کا ہم شکل بنا لینے کے ولولوں سے آراستہ ہوتے ہیں___ آپ کی بات اپنی جگہ___ مگر میں ابھی مکمل مایوس نہیں ہوا کہ ابھی کچھ پرندوں میں اڑانوں کی آرزوئیں دھڑکتی ہیں!

(محمد فیروز شاہ۔ میانوالی)

''انگارے'' کے دو شمارے ایک ساتھ موصول ہوئے۔ بہت شکریہ، موصولہ شماروں کا رنگ خاص تنقیدی اور تحقیقی ہے تاہم خوش کن اَمر یہ ہے کہ آپ تخلیقی زاویے کو بھی نمایاں کرنے میں مصروف ہیں۔ سعادت حسن منٹو نمبر میری خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ آپ نے منٹو کے فکر و فن کی گہرائی تک رسائی کے لیے جو انداز اپنایا ہے وہ یکسر منفرد اور اچھوتا ہے۔ آپ کی اس کاوش کے مطالعے سے تفہیم منٹو کے حوالے سے بعض نئی جہتوں سے متعارف ہونے کا موقع میسر آیا۔

بعض دوسرے ادبی رسائل کے مدیران محترم نے بھی تفہیم منٹو کے ذیل میں عمدہ کاوشیں کیں تاہم آپ کی یہ پیش کش اس اعتبار سے قابل قدر ہے کہ اس میں منٹو سیمینار میں پڑھے گئے مضامین اور ان مضامین پر ہونے والی بحثوں کو مربوط کیا گیا ہے۔ یہ نگارشات اس درجہ دل پذیر، پُر مغز اور معلومات افزا ہیں کہ منٹو کی تفہیم کا ذوق رکھنے والوں پر کئی بند دریچے کھلتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔ اہم بات یہ کہ آپ نے مقدار کے بجائے معیار کی پیش کش کا مشکل مگر تادیر یاد رہنے والے جادۂ صحیح کا انتخاب کیا ہے۔ عہد ساز اور رجحان ساز شاعروں ادیبوں کی بنیادی فکر کو سمجھنے کا میرے خیال میں یہی بہتر ذریعہ ہے

اس شمارے کے 'حصہ دوم' میں ڈاکٹر انوار احمد کے مقالے ''سعادت حسن منٹو___ برصغیر کا تخلیقی ضمیر'' پر مقالہ نگار کو اتنی ہی زبردست داد ملنی چاہیے جتنی کسی کل پاکستان مشاعرے میں سامعین کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والے شاعر کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ منٹو پر لکھے گئے صف اول کے مقالوں میں شمار ہوگا۔ انگارے کی 'طباعی بحالی' خاص طور پر منٹو سیمینار نمبر کی پیش کش پر میرے طرف سے گلہائے تبریک و تحسین قبول فرمائیں 'کتابیات' ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی محنت کی اہمیت کیا ہے؟ اس کا جواب مستقبل کے وہ محققین دیں گے جنہیں مواد کی فراہمی کا مرحلہ آسانی کے ساتھ طے کرنے میں مدد ملے گی۔

(شبیر احمد قادری، فیصل آباد)

''انگارے'' کے تین سال مکمل ہونے پر مبارک باد۔ جرائد و رسائل کی موجودہ صورتحال میں کسی ادبی جریدے کا تین سال تک مسلسل اور پابندی سے شائع ہو جانا بہرحال ایک کارنامہ ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ تعریف و توصیف کو نظر انداز کرتے ہوئے ''انگارے'' کی تین سالہ کارکردگی کے جائزے پر مشتمل ایک گوشہ بھی سامنے آئے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ ''انگارے'' کے حوالے سے کیا صحیح اور غلط ہے،

اس کے اثرات اور قارئین کا حلقہ کیا سوچتا ہے اور اس نے اپنے مقاصد کس حد تک حاصل کیے ہیں وغیرہ بلکہ اس کا ایک نمبر تو بدلتے حالات میں ترقی پسندی کے بدلتے ہوئے تصور، اس کی نئی تعریف اور نئے و پرانے ترقی پسند ادب کی بنیادوں اور حدود پر بحث کے حوالے سے ہونا چاہیے ترقی پسند حلقوں میں ایسی مباحث پندرہ سولہ سالوں سے جاری ہیں ''انگارے'' ۳۵ اور ۳۶ مل گئے ہیں۔ منٹو سیمینار نمبر خاصے کی چیز ہے اور ایک اہم دستاویز ہے۔ ابھی چونکہ زیر مطالعہ ہے لہٰذا اس پر اپنا اظہار پھر سہی۔ البتہ ۳۵ میں شاعروں پر پانچ مضامین انگارے میں خود ایک ریکارڈ ہے۔ ''مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید کے مقام کا تعین'' بہت اچھا ہے یہ سلسلہ معاصر ترقی پسند فکری تسلسل کی تفہیم میں بہت اہم ہے گو یہ سوال اپنی جگہ بحث طلب ہے کہ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند حقیقت پسندی (حقیقت نگاری) میں کیا فرق ہے۔ ایم خالد فیاض کا مضمون اپنے مزاج اور رویے میں علمی اختلاف کی بہترین مثال ہے ہمارے ''گنڈاسہ مارکہ'' ادبی مناظروں کو اس سے ضرور سیکھنا چاہیے۔

(روش ندیم۔ کراچی)

انگارے کے دو شمارے جنوری، فروری ۲۰۰۶ء ایک ساتھ ملے۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ نے منٹو نمبر بھی یقیناً بھیجا ہوگا مگر وہ پوسٹ آفس کی نذر ہو گیا ہوگا۔ بقر عید میں میرا پوسٹ مین رخصت پر چلا گیا تھا اس کی عدم موجودگی میں جسے لگایا گیا تھا وہ ہفتوں ہفتوں نہیں آتا تھا۔ متعدد رسائل مجھے نہیں ملے۔ میں آپ کو خط بھی نہ لکھ سکا۔ اِدھر ایک فرنچائز پوسٹ آفس تھا بند ہو گیا ہے۔ اب مجھے خط ڈالنا ہو تو خاصا دور جانا ہوتا ہے۔ میں مہینے بھر کے خطوط جمع کر کے رکھ لیتا ہوں پھر جب کبھی اِدھر جانا ہوتا ہے انہیں سپرد ڈاک کرتا ہوں۔ اس طرح میرے خط بھی لیٹ ہو جاتے ہیں۔

اِس بار میں ابھی دونوں شماروں کے صرف شعری حصے اور چند مضامین ہی پڑھ سکا ہوں۔ حسب معمول انگارے کا معیار قائم رکھا گیا ہے۔ جنوری کے شمارے میں مجید امجد کی پیکر تراشی پر آپ کا مضمون اچھا لگا۔ غزلوں میں غلام حسین ساجد کی غزلیں حسبِ معمول نحیف و نزار نظر آئیں۔

مری نحیف صداؤں پہ کان دھرتے ہوئے ___ تو میرے رنگ میں کھو کر کبھی پکار مجھے

(اب انہیں کون بتائے کہ اُن کے رنگ میں کھو کر (یعنی نحیف صدا میں) اگر انہیں کسی نے پکارا بھی ہوگا تو وہ سن نہیں سکے ہوں گے) اس غزل میں ایسے ایسے شعر ہیں کہ بس مثلاً ایک شعر پھر سے پڑھ لیں۔

نیام کمر نہیں پاتا ہوں تیغ آسائش ستا رہی ہے کوئی شکل بار بار مجھے

مجھے تو وہ ایک ایسے شاعر نظر آ رہے ہیں جن کے ہر شعر میں دو شعر ہوتے ہیں۔ اِس طرح بقول خود وہ موجود کے انتشار کو تاریخ کے بے مہر جبر کے ساتھ رکھ کر شناخت کرنے کی سعی کرنے والوں اور اُسے آگے بڑھانے والوں میں واقعی شمار کیے جا سکتے ہیں (حوالے کے لیے ان کا مضمون اُردو غزل بیسویں صدی میں'' جو سہ ماہی ''آئندہ'' کے بیسویں صدی نمبر مطبوعہ دسمبر ۲۰۰۰ء میں چھپا، دیکھا جا سکتا

ہے۔) یہاں ان کے جملے میں ''بے مہر جبر'' کی داد بھی ہم پر واجب ہے۔ کچھ اور لکھنا مناسب نہیں، میرے دوست ہیں۔ ان کی غزل کا شعر ہے:

بہت سے انگ بھی رکھتے ہیں طاقت پرواز ہوا میں صرف پرندے نہیں اُڑا کرتے

اِسے پڑھ کر اپنا ایک بیس بائیس سال پہلے کہا ہوا شعر یاد آیا۔

کچھ عکس آئنوں میں اُبھرتے نہیں کبھی
کچھ رنگ تتلیوں کی طرح بھاگتے بھی ہیں

ان کے مضمون میں کسی شاعر محمد خالد تک کا ذکر ہے جنہیں انہوں نے ''خصوصی اہمیت'' کا حامل قرار دیا ہے مگر اس تمام مضمون میں کہیں اِس ناچیز راقم الحروف کا کوئی ذکر نہیں اور اچھا ہی ہوا کہ نہیں تھا کیونکہ اس میں جہاں انہیں محمد علوی ادھوری جدیدیت کی ایک کمزور مثال، صابر ظفر شعری چٹکلے باز اور جاوید شاہین بے آہنگ تک بند نظر آئے ہیں وہیں انہیں رفیق سندیلوی اور قمر رضا شہزاد وغیرہ کی غزل، اُردو غزل کا سب سے اہم حوالہ محسوس ہوئی ہے۔ خدانخواستہ اگر وہ اس میں کہیں میرا ذکر کر بیٹھتے تو نہ جانے کیا رائے دیتے ___ ڈر کے مارے کچھ اور نہیں لکھ سکتا۔ انہی کا تازہ شعر حاضر ہے۔

ہوائے دہر نے کتنا بدل دیا ہے مجھے
وہ ڈر رہے ہیں مرے خواب میں بھی آتے ہوئے

ایسے تازہ کار شعر ہمیں پڑھواتے رہیں جیسے اِن کی ''غزل'' کا یہ شعر ہے:

بہت کشادہ تھی یہ ارض پاک اُن پر بھی
اگر وہ گھر سے نکلنے کا حوصلہ رکھتے

تاکہ ہم (یعنی قارئین) ان کے ''وہ'' کی طرح نہ رہیں جس کو کچھ پتا ہی نہیں کسی بات کا۔ میں اِن کے اِس شعر کی ''غزلیت'' سے بھی بے پناہ متاثر ہوا ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے دوست جمشید ساحل صاحب اپنے طویل خط میں (مطبوعہ انگارے فروری ۲۰۰۶ء) کاشف مجید اور اوصاف نقوی وغیرہم کے اشعار سے متاثر نظر آتے ہیں ___

اس بار فروری کے شمارے میں دو غزلیں بیک وقت خاور اعجاز اور پرویز ساحر کے نام سے چھپ گئی ہیں۔ آپ نے جنوری میں خطوط نہیں چھاپے۔ جناب یہ سلسلہ جاری رکھئے۔ یہ صفحات رسالے کے قیمتی صفحات ہوتے ہیں۔ قارئین اور ادیبوں کو چاہیے کہ رسالہ پڑھنے کے بعد اپنی بے لاگ رائے سے ضرور نوازا کریں تاکہ لکھنے والوں کو معلوم ہو سکے۔ کہتی ہے ان کو خلق خدا غائبانہ کیا۔

(احمد صغیر صدیقی۔ کراچی)

نومبر اور دسمبر کے دونوں شمارے موصول ہو گئے شکریہ ___ دسمبر کا شمارہ منٹو سیمینار نمبر سے معنون کر کے بڑا کام کیا ہے۔ منٹو کی تخلیقات نیز شخصیات سے متعلق بہت کچھ معلومات ہو جائیں گی۔ ایک

اچھے افسانہ نگار پر جو اپنے مخصوص اسلوب اور طرزِ نگارش کی وجہ سے مشہور ہے کچھ کام ہونا چاہیے۔ مبارک باد قبول فرمائیں۔ ابھی مکمل پڑھا نہیں ہے بعد میں ہوسکتا ہے کچھ تبصرہ کروں۔ نومبر کے شمارے میں میری غزل کا ایک شعر کتابت کی غلطی کی نذر ہوگیا ہے۔ شعر تھا:

بعد مدت کے آئینہ دیکھا
خود کو پہچاننے میں دیر لگی

مگر مدت کی بجائے موت چھپ گیا ہے تصحیح فرمالیں۔ آپ کی مسلسل کاوشوں اور دل جمعی کے ساتھ ''انگارے'' کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں خدا آپ کو ہمت اور سکت عطا کرے۔ نومبر کے پرچے میں ڈاکٹر روبینہ رفیق، اخلاق انصاری کی پیاس ہی پیاس، تنویر صاغر کی تحریریں پسند آئیں۔ ایک بات ہے کہ آج کل کمپوزنگ کی غلطیاں برائے نام رہ گئی ہیں۔ اگر پروف ریڈر محنت کرے تو پرچہ اس عیب سے پاک ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر فہم اور اہلِ نظر تو خامیوں کو سمجھ سکتے ہیں جو کمپوزنگ کی وجہ سے ہوں مگر بہت سارے قارئین شائد نہ سمجھ کر معنوی بکھیڑوں میں اُلجھ سکتے ہیں۔

(شارق بلیاوی، کراچی)

آپ کے شمارے جنوری اور فروری ایک ساتھ وصول ہوئے شکریہ امید ہے کہ آپ بالکل بخیریت ہوں گے۔ سب سے پہلے ''منٹو سیمینار نمبر'' نکالنے پر بہت بہت مبارک باد قبول کریں آپ کا منٹو نمبر بھی بہت اچھا تھا۔ خدا کرے ''انگارے'' اسی طرح دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا رہے۔ اشفاق احمد مرحوم پر ابھی تک کچھ آپ کے رسالے کی طرف سے نہیں آیا اور حنیف رامے صاحب کی بابت بھی کچھ نہیں تحریر کیا گیا دونوں عظیم ہستیاں تھے۔ آپ کے تحقیقی مضامین بہت اچھے ہوتے ہیں۔ میں نے پہلے بھی عرض کی تھی کہ اگر پرانے انگارے کے شمارے آپ کے پاس ہوں تو مجھے لکھ دیں کتنے عرصہ کے ہیں تاکہ میں آپ کو لکھ کر منگوا سکوں اور یہ بھی مجھے لکھ دیں کہ میرا چندہ کتب ختم ہو رہا ہے یا پھر جب انگارے کا چندہ ختم ہو مجھے V.P.P بھیج دیا کریں۔ مارچ کے شمارے کا انتظار ہے۔

(ڈاکٹر اسلم خان، ایبٹ آباد)

جنوری اور فروری کے دو شمارے ایک ساتھ ملے سب سے پہلے راقم نے انگارے کے اداریئے پڑھ لیے۔ میں کچھ دنوں سے علیل ہوں، ساتھ ہی لغات فلسفہ کی کمپوزنگ اور ترسیل کی وجہ سے جم کر مطالعہ ممکن نہیں ہو رہا ہے جس کی معذرت انگارے کے مضامین نظم ونثر کے بارے کیا لکھنا یا نہ لکھنا۔ آپ جس فکر انگیز طریقے سے مضامین جمع کرتے ہیں اور اہل قلم آپ سے تعاون کرتے ہیں یہ بات لائق مبارکباد ہے۔ جہاں تک اداریوں کے ذریعے آپ جس صراط مستقیم کا ذکر فرماتے ہیں اس میں زبان، ادب ذاتی تشہیر، سوقیانہ مکالمات سبھی کچھ آجاتے ہیں، ترقی پسندی کا محض یہ مفہوم تو نہیں ہے کہ چلتی گاڑی کو روکنے اور سگنل تبدیل کرنے کی طرف متوجہ کیا جائے۔ البتہ اہل قلم اور میڈیا کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ

روایتی انداز فکر کو منسوخ کر کے سائنس اور فلسفے کی طرف آئیں۔ فلسفہ اور سائنس بھی اس قدر خشک نہ ہو کہ انسانی دماغ اس کی تفہیم سے ہی عاجز ہو۔

آپ نے منٹو نمبر شائع کیا تھا، منٹو کی تقصیر یا اعلیٰ ظرفی یہ تھی کہ وہ معاشرے میں جو کچھ تھا وہی لکھتا ہے بلکہ ایک بار اس نے عدالت کے اس سوال کا جواب دیا تھا کہ اگر معاشرے کو سر کے بل کھڑا کرنے کے بجائے قدموں کے بل کھڑا کر سکو تو میں وہ سب چیزیں لکھنا بند کر دوں جنہیں تم ظاہر میں فحاشیات کہتے ہو اور پس پردہ ننگے ہو کر ڈانس کرتے ہو؟

انگارے میں علمی مضامین نہایت لائق مطالعہ اور افسانے دل لگا کر پڑھنے والے ہوتے ہیں غزل کے حصے میں جدید شعراء نے غزل کی تقدیس وآبرو کو جس طرح بڑھایا ہے یا بڑھا رہے ہیں اور آپ اُن کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں اس سے کم از کم مجھے تو اپنی سابقہ فکری کاوشوں سے خاصی ندامت ہوتی ہے۔ صابر ظفر کی تمام غزلیں نئے تجربات سے مالا مال ہیں، خاور اعجاز کا کیا کہنا، ہر غزل معجزے سے کم نہیں۔ پرویز ساحر عہد حاضر میں نئے سٹائل کے شاعر ہیں، غزل میں ان کا جدلیاتی انداز شاندار ہے۔ حصیر نوری نے کیا خوب کہا دیر تک دھوپ میں جلتا رہا سایہ اپنا، نیا مضمون، نیا تجربہ ومشاہدہ ہے۔ عطاالرحمٰن قاضی کی غزل کا جواب نہیں کئی شعر پسند آئے۔

انگارے کی طباعت، گیٹ اپ، اغلاط سے مبرا کمپوزنگ دیکھ کر طبیعت میں ندرت وبہجت کا احساس آتا ہے۔ حیرت ہے کہ اِس عہدِ گرانی اور دورِ سرگرانی میں آپ اور شاہد علی خان الحمرا والے اِسی طرح سپوتنک والے آغا امیر حسین کس طرح جریدے چھاپ لیتے ہیں اور بیچ بھی لیتے ہوں گے۔ باقی جو رہ جاتے ہیں اُنہیں کیا کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر خیال امروہوی۔ لیہ)

رسید واطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، ڈاکٹر معین الدین عقیل (کراچی)، ڈاکٹر علی ثنا بخاری (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، افتخار عارف (اسلام آباد)، ناصر بخاری (اسلام آباد)،، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، حصیر نوری (کراچی)، فہیم شناس کاظمی (نواب شاہ سندھ)، ڈاکٹر روبینہ شاہین (پشاور)، صابر عظیم آبادی (کراچی)، عارف ثاقب (لاہور)، خالد فتح محمد (گوجرانوالہ)، کاشف مجید (اوکاڑہ)، تنویر صاغر (لاہور)، احمد پراچہ (کوہاٹ)، وارث خان (سوات)، سجاد مرزا (گوجرانوالہ)، ڈاکٹر افتخار بیگ (لیہ)، صابر ظفر (کراچی)، شریف بٹ (جہلم) ڈاکٹر علمدار بخاری (سرگودھا)، محمد امین الدین (کراچی)، نسیم عباس (ساہیوال)، جمن جنجنی (لاڑکانہ)

☆☆☆